رتی ماشہ تولہ

سعادت حسن منٹو

تمام غیر مطبوعہ افسانوں کا تازہ مجموعہ

رتی ماشہ اور تولہ

سعادت حسن منٹو

ظفر برادرز ظفر منزل بنک سکوئر دی مال لاہور
دی مال مری

قیمت تین روپے

ظفر احمد قریشی
پرنٹر پبلشر
نے
پنجاب آرٹ پریس لاہور
سے
چھپوا کر
ظفر برادرز
لاہور
سے شائع کیا

فون نمبر ۶۴۴۴۸

فہرست

منٹو کی پہلی برسی ۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء کی غمگین صبح کو شائع کی گئی ۔!

۷۸۶

یہاں

سعادت حسن منٹو

سو رہا

ہے

جس کو

اب بھی

یقین

ہے

کہ وہ

لوح جہاں

پر

حرف مکرر نہیں

تھا

—

(منٹو)

جُھکے

سنار کی انگلیاں جھمکوں کو برش سے پالش کر رہی ہیں۔ جھمکے چمکنے لگتے ہیں۔ سنار کے پاس ہی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جھمکوں کی چمک دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتما اٹھتی ہیں۔ بڑی بے تابی سے وہ اپنے ہاتھ ان جھمکوں کی طرف بڑھاتا ہے اور سنار کہتا ہے "بس اب دے دو مجھے!" سنار اپنے گاہک کو اپنی ٹوٹی ہوئی عینک میں سے دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے "چھ مہینے سے الماری میں پڑے تھے۔ آج آئے ہو تو کہتے ہو کہ ہاتھوں پہ سرسوں جما دوں۔"

گاہک جس کا نام چرنجی ہے کچھ شرمندہ ہو کر کہتا ہے "کیا بتاؤں لالہ کروڑی مل۔ اتنی رقم جمع ہونے میں آتی ہی نہیں تھی۔ تم سے الگ شرمندہ، جورو سے الگ شرمندہ۔ عجب آفت میں جان پھنسی ہوئی تھی۔ جانے اس سونے میں کیا کشش ہے کہ عورتیں اس پہ جان دیتی ہیں۔"

○ سنار پالش کرنے کے بعد جھمکے بڑی صفائی سے کاغذ میں لپیٹتا ہے اور

چرنجی کے ہاتھوں میں رکھ دیتا ہے۔ چرنجی کاغذ کھول کر جھمکے نکالتا ہے جب وہ جھم جھم کرتے ہیں۔ تو وہ مسکراتا ہے "بھئی کیا کاریگری کی ہے لالہ کروڑی مل۔ دیکھے گی تو پھڑک اُٹھے گی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالتا ہے، اور سُنار سے یہ کہہ کر "کھرے کر لو بھائی" دکان سے باہر نکلتا ہے۔

دکان کے باہر ایک تانگہ کھڑا ہے۔ گھوڑا ہنہناتا ہے تو چرنجی اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے "تمہیں بھی دو جھمکے بنوا دوں گا۔ میری جان۔ فکر مت کرو" یہ کہہ کر وہ خوش خوش گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے "چل میری جان ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

چرنجی خوش خوش اپنے طویلے پہنچتا ہے۔ دھیمے سروں میں کوئی گیت گنگناتا اور یوں اپنی خوشی کا اظہار کرتا وہ گھوڑے کو تھپکی دیتا اور کہتا ہے۔ "ابھی چھٹی نہیں ملے گی۔ میری جان! تیری مالکن یہ جھمکے پہن کر کیا باغ کی سیر کو نہیں جائے گی۔"

چرنجی جلدی جلدی گھر کا زینہ طے کرتا ہے اور زور سے آواز دیتا ہے۔ "مُنّی — مُنّی —" ایک چھوٹی سی لڑکی بھاگتی ہوئی اندر سے نکلتی ہے اور چرنجی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے۔ چرنجی جھمکے نکال کر اس کی کانوں کے لوؤں کے ساتھ لگاتا ہے اور کہتا ہے "ماں کہاں ہے تیری —" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ

گھر کے سارے کمروں میں ہاتھ میں جھمکے لئے گھومتا ہے "منی کی ماں ــــ منی کی ماں کہتا" لڑکی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ جب وہ سب کمروں میں گھومتا باہر نکلتا ہے تو مڑ کر پھر اپنی لڑکی سے پوچھتا ہے "منّی ماں کہاں ہے تیری؟" لڑکی جواب دیتی ہے "وہاں گئی ہے!" لڑکی کا اشارہ سامنے بلڈنگ کی طرف تھا۔ چرنجی اُدھر دیکھتا ہے۔ کھڑکی کے شیشوں سے اسے ایک مرد اور ایک عورت کا سایہ نظر آتا ہے۔ مرد عورت کے کانوں میں بُندے پہنا رہا ہے۔ لمبے لمبے بُندے۔ یہ منظر دیکھ کر چرنجی کے منہ سے دبی ہوئی چیخ سی نکلتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ننھی بچی کو اٹھا کر سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ جیسے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بچی اس خوفناک سائے کو دیکھے۔ سینے کے ساتھ اس طرح اپنی بچی کو بھینچے وہ آہستہ آہستہ نیچے اُترتا ہے۔ وہ جھمکے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے ہاتھوں سے فرش پر گر پڑتے ہیں۔

نیچے طبیلے میں آکر وہ اپنی بچی کو جو کہ سخت پریشان ہو رہی ہے تانگے میں بٹھاتا ہے اور خود گھوڑے کی باگیں تھام کر تانگے کو باہر نکالتا ہے۔

چرنجی بالکل خاموش ہے۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ اس کی ننھی بچی سہمے ہوئے لہجے میں بار بار پوچھتی ہے "ماتا جی کے جھمکے کہاں ہیں پتا جی؟۔ ماتا جی کے جھمکے کہاں ہیں پتا جی؟"

چرنجی کی بیوی اپنے گھر واپس آگئی ہے اور ایک آئینہ سامنے رکھے اپنے جھمکوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے اور گا رہی ہے آئینہ دیکھتے دیکھتے وہ اپنی بچی کو آواز دیتی ہے "منّی۔ ادھر آ تجھے ایک چیز دکھاؤں۔" وہ نہیں آتی۔ چنانچہ وہ پھر آواز دیتی ہے "منّی۔ منّی" —— کوئی جواب نہیں ملتا۔ "کہاں چلی گئی تو —— ؟" یہ کہہ کر وہ اٹھتی ہے اور ادھر اُدھر اسے ڈھونڈتی ہے۔ جب وہ نہیں ملتی۔ تو باہر نکلتی ہے۔ سیڑھیوں کے اختتامی سرے پر جو چبوترہ سا بنا ہے۔ اس پر پھٹے ہوئے کاغذ میں اسے دو جھمکے دکھائی دیتے ہیں۔ چرنجی کی بیوی ان کو اٹھاتی ہے ایک دم اسے خوفناک حقیقت کا احساس ہوتا ہے ان جھمکوں کو مٹھی میں بھینچ کر وہ چیختی ہے "اُسے معلوم ہو گیا ہے اُسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے" دیوانوں کی طرح دوڑی دوڑی وہ اندر جاتی ہے۔ سب کمروں میں پاگلوں کی طرح چکّر لگاتی ہے اور منی کو آوازیں دیتی۔ جب اس کے دماغ کا طوفان کچھ کم ہوتا ہے تو وہ وہیں بیٹھ جاتی ہے۔ جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ سامنے اس کے آئینہ پڑا ہے۔ اس میں وہ اپنی غیر ارادی طور پر اپنی شکل دیکھتی ہے —— چرنجی کی بیوی جب اپنی شکل اس زاویے میں دیکھتی ہے تو اس سے متنفر ہو کر آئینہ اٹھاتی ہے اور زمین پر پٹک دیتی ہے۔ آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اٹھتی ہے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر نکلتی ہے۔

سامنے والی بلڈنگ کا ایک کمرہ —— یہ کمرہ پُرتکلف طریقے پر سجا ہوا

ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا جن کی عمر میں تقریباً دو برس کا فرق ہے۔ لڑکی چھ برس کی اور لڑکا آٹھ برس کا ہے۔ دونوں اپنے باپ کے پاس بیٹھے ہیں اور اس سے کھیل رہے ہیں۔ اتنے میں دروازے پہ ہولے ہولے دستک ہوتی ہے۔ پہلی بار جب دستک ہوتی ہے تو بچوں کا باپ نہیں سنتا۔ جب دوسری بار پھر ہوتی ہے تو وہ چونکتا ہے بچوں کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ان کی آیا کی طرف اور کہتا ہے: "ان کو باہر لے جاؤ۔ کوئی میرا ملنے والا آیا ہے۔" جلدی جلدی بچوں کو نکال کر وہ دروازہ بند کرتا ہے۔ دوسرے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ جب دروازہ کھولتا ہے تو چرنجی کی بیوی اندر داخل ہوتی ہے اس کو دیکھ کر بچوں کے باپ کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے "تم تو کہہ رہی تھیں۔ مجھے جلدی گھر جانا ہے۔ اب واپس کیسے آگئیں"
چرنجی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی۔ ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ اس کو خاموش دیکھ کر وہ پھر اس سے پوچھتا ہے "وہ ابھی تک واپس نہیں آیا؟"

چرنجی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی۔ وہ پھر اس سے سوال کرتا ہے "تم خاموش کیوں ہو؟ تمھیں جھمکے پسند نہیں آئے؟" چرنجی کی بیوی کے ہونٹ کھلتے ہیں۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہے "کیوں نہیں آئے۔ بہت پسند آئے ہیں۔ کیا اور لادو گے مجھے؟" بچوں کا باپ مسکراتا ہے "جتنے کہو۔" "بس یہی بات تھی" ۔ بڑے تلخ لہجے میں چرنجی کی بیوی کہتی ہے "بس یہی بات تھی۔ لیکن مجھے صرف جھمکے ہی نہیں چاہئیں۔ ناک کے لیے کیل۔ ہاتھوں کے لیے کنگنیاں۔ گلے کے لیے ہار۔

ماتھے کے لئے جھومر۔ پاؤں کے لئے پازیب ــــ مجھے اتنے زیور چاہئیں کہ میرا باپ ان کے بوجھ تلے دب جائے ــــ اپنی عصمت کا زیور تو میں اتار چکی۔ اب یہ گہنے نہ پہنوں گی تو لوگ کیا کہیں گے "۔ بچوں کا باپ یہ گفتگو سن کر سخت متحیّر ہوتا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ چرنجی کی بیوی سے کہتا ہے "یہ تو کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے" ــــ چرنجی کی بیوی جواب دیتی ہے "بہکی پہلے تھی اب تو ہوش کی باتیں کر رہی ہوں ــــ سُنو۔ میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ وہ چلا گیا ہے۔ میری بچی کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے ــ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ جس طرح میری لُٹی ہوئی آبرو واپس نہیں آئے گی۔ . . . . . بولو ــــ مجھے پناہ دیتے ہو ــــ میں تمہیں اس باپ کا واسطہ دے کر التجا کرتی ہوں۔ کہ جو تم نے اور میں نے دونوں نے مل کر کیا ہے کہ مجھے پناہ دو ــــ" بچوں کا باپ چرنجی کی بیوی کی سب التجائیں سُنتا ہے۔ مگر وہ کیسے اس عورت کو پناہ دے سکتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو جھمکوں کے بدلے بیچا۔ ایک سودا تھا جو ختم ہو گیا۔ چرنجی کی بیوی کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے۔ ناکام اور مایوس ہو کر وہ چلی جاتی ہے۔

چرنجی اب ایک نئے گھر میں ہے۔ رات کا وقت ہے۔ وہ اپنی بچی نُنی کو سلانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ نہیں سوتی۔ بار بار وہ اپنی ماں کے بارے میں پوچھتی ہے۔ چرنجی اس کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے مگر بچی کی معصوم باتیں اس کو پریشان کر دیتی ہیں۔ آخر میں گھبرا کر اس کے منہ سے یہ نکلتا ہے "منی تمہاری ماتا جی مر گئی ہیں ــــ رستہ بھول کر وہ ایسی جگہ چلی گئی ہیں۔ جہاں سے واپس

آنا بڑا مشکل ہوتا ہے — دروازہ کھلتا ہے۔ چرنجی فوراً منی کا چہرہ کمبل سے ڈھانپ دیتا ہے۔ چرنجی کی بیوی داخل ہوتی ہے۔ چرنجی اٹھتا ہے اور اُسے باہر دھکیل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیتا ہے — "چلی جاؤ یہاں سے" وہ اس سے کہتا ہے۔ چرنجی کی بیوی جواب دیتی ہے "چلی جاتی ہوں مجھے میری بچی دے دو" چرنجی غصّے اور نفرت بھرے لہجے میں اس سے کہتا ہے "وہ عورت جو مرد کی بیوی نہیں بن سکتی۔ اولاد کی ماں کیسے بن سکتی ہے اپنے پاپ بھرے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو۔ کیا تمہیں منی کی ماں کہلانے کا حق حاصل ہے؟ کیا اس دن کے بعد جب تم نے یہ جھمکے لے کر ایک غیر مرد کو ہاتھ لگانے دیا۔ تم اپنی اولاد کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر سکتی ہو — کیا تمہاری ممتا اس دن جل کر راکھ نہیں ہو گئی تھی۔ جب تمہارے قدم ڈگمگائے تھے — اپنی بچّی لینے آئی ہو۔ وہ جھمکے پہن کر جنہوں نے تمہاری زندگی کے سب سے قیمتی زیور کو اُتار کر گندی موری میں پھینک دیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں جب یہ جھمکے ہلتے ہیں تو تمہارے کانوں میں یہ آواز نہیں آتی کہ نہ تم ماں رہی ہو نہ بیوی — جاؤ تمہاری مانگ سیندور سے اور تمہاری گود اولاد سے ہمیشہ خالی رہے گی — جن قدموں سے آئی ہو۔ اُنہیں قدموں سے واپس چلی جاؤ" چرنجی اپنی بیوی کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ تو وہ چلی جاتی ہے — افسردہ اداس خاموش! —

ٹانگے کا پہیہ گھوم رہا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ وقت گذر رہا ہے۔ اور کئی سال بیت رہے ہیں۔ ٹانگے کا پہیہ مڑتا ہے اور ایک بڑے دروازے میں داخل ہوتا ہے۔ یہ دروازہ گورنمنٹ کالج کا ہے جس میں سے کئی لڑکے اور لڑکیاں گذر رہی ہیں۔ ٹانگہ کالج کی کمپاؤنڈ میں ٹھہرتا ہے۔ چترنجی اب کافی بڈھا ہو چکا ہے۔ تقریباً آدھے بال سفید ہیں۔ اس کی ننھی بچی اب جوان ہے۔ ٹانگے کی پچھلی نشست پر سے جب اُٹھتی ہے۔ تو چترنجی اس کو بہت نصیحتیں کرتا ہے۔ بڑے صاحب کو ہاتھ جوڑ کے کہنا۔ جو سوال پوچھیں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا وغیرہ وغیرہ لڑکی اپنے باپ کی ان باتوں سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اور اچھا اچھا کہتی وہاں سے چلتی ہے۔ لیکن فوراً ہی چترنجی اس کو روکتا ہے۔ اور جیب سے برفی نکال کر اس کو دیتا ہے اور کہتا ہے "پہلا دن ہے منہ میٹھا کر لو" زبردستی وہ اپنی لڑکی کے ہاتھ میں برفی رکھ دیتا ہے۔

سامنے کالج کے برآمدے میں دو تین لڑکے کھڑے ہیں، جو کالج آنے جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو گھور رہے ہیں۔ جب کرشنا کماری (چترنجی کی لڑکی) برآمدے کی طرف آتی ہے۔ تو ایک لڑکا جس کا نام جگدیش ہے۔ اپنے ساتھی کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھونکا دیتا ہے اور کہتا ہے "لو بھئی ایک فسٹ کلاس چیز آئی ہے۔ طبیعت صاف ہو جائے گی تمہاری" یہ کہہ کر جب کرشنا کماری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو اس کے دوست سب ادھر متوجہ ہوتے ہیں مگر

اُنہیں کرشنا کماری کی بجائے ایک دیہاتی لڑکا نظر آتا ہے جو بڑے انہماک سے اپنے فارم کا مطالعہ کرتا ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ سب لڑکے اس دیہاتی کو دیکھ کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی کیا چیز ہے۔ طبیعت واقعی صاف ہو گئی ہے" کرشنا کماری اس دوران میں ایک طرف ہو گئی تھی یہ دیہاتی لڑکا جس کا نام کرشن کمار ہے، کالج کے ان پرانے شریر طالبعلموں کی طرف بڑھتا ہے۔ جگدیش سے وہ بڑے سادہ لہجے میں پوچھتا ہے "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے؟" جگدیش ذرا پیچھے ہٹ کر کرشن کمار کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے اور کہتا ہے "چڑیا گھر"۔ کرشن کمار اسی طرح سادہ لوحی سے کہتا ہے "جی نہیں۔ چڑیا گھر میں کل جاؤں گا۔ میں یہاں داخل ہونے آیا ہوں" سب لڑکے بیچارے کرشن کمار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اُسے چھیڑتے ہیں۔ اتنے میں ایک لڑکی کرشنا کماری کو ساتھ لئے ان لڑکوں کے پاس آتی ہے۔ اور ان میں سے ایک لڑکے کو جس کا نام ستیش ہے مخاطب کر کے کہتی ہے "ستیش۔ میرا پیریڈ خالی نہیں۔ تم انہیں بتا دو کہ کہاں داخلہ ہو رہا ہے۔" کرشنا کماری کا فارم ستیش کو دے کر وہ تیز قدمی سے چلی جاتی ہے۔ ستیش فارم دیکھتا ہے اور کہتا ہے "آپ کا نام کرشن کماری ہے؟" کرشن کمار بول اُٹھتا ہے "جی نہیں۔ میرا نام کرشن کمار ہے" سب ہنستے ہیں۔ ستیش کرشن کمار کا فارم بھی لے لیتا ہے۔ اور دونوں سے کہتا ہے "آیئے کمار اور کماری صاحبہ میں آپ کو رستہ بتا دوں" سب چلتے ہیں۔

اس کمرے کے باہر جہاں داخلہ ہو رہا ہے۔ سنتیش ٹھہر جاتا ہے۔ اور ایک فارم کرشن کمار کو اور دوسرا کرشن کماری کو دے کر کہتا ہے "تاندر چلے جایئے۔" کرشن کمار اور کرشن کماری دونوں اندر داخل ہوتے ہیں۔ کرشن کمار ایک میز کی طرف بڑھتا ہے کرشن کماری دوسرے میز کی طرف ۔۔۔ ادھر کرشن کماری کا انٹرویو شروع ہوتا ہے۔ اُدھر کرشن کمار کا ۔۔۔ کرشن کماری کا فارم پڑھ کر پروفیسر کہتا ہے "آپ کبڈی کھیلتے ہیں۔ کشتی لڑتے ہیں۔ گولہ پھینکتے ہیں"۔۔۔ اُدھر دوسرا پروفیسر کرشن کمار سے کہتا ہے ۔۔۔ "آپ کو کشیدہ کاری۔ کروشیے اور سلائیوں کے کام کا شوق ہے" کرشن کمار اور کرشن کماری دونوں حیران رہ جاتے ہیں کرشن کماری پروفیسر سے کہتی ہے ۔۔۔ "جی نہیں مجھے تو کشیدہ کاری۔ کروشیے اور سلائیوں کے کام کا شوق ہے"۔۔۔ اُدھر کرشن کمار پریشان ہو کر پروفیسر سے کہتا ہے ۔۔۔ "جی نہیں مجھے تو کبڈی کھیلنے۔ گولہ پھینکنے اور کشتی لڑنے کا شوق ہے۔" دونوں کے فارم تبدیل ہو گئے تھے۔ ہال میں قہقہے بلند ہوتے ہیں ۔۔۔ ہال کی کھڑکیوں کے باہر جگدیش اور ستیش اور ان کی پارٹی کھڑی یہ سب تماشا دیکھتی رہتی ہے۔

بازار میں ٹانگہ کھڑا ہے۔ رحیم بخش اس کو صاف کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک پٹھان آتا ہے اور رحیم بخش سے ان دو سو روپوں کا تقاضا شروع کر دیتا ہے۔ جو اس نے قرض لے رکھے ہیں۔ پٹھان روز روز کے وعدوں

سے تنگ آیا ہوا ہے چنانچہ وہ چرنجی سے بڑے درشت لہجے میں باتیں کرتا ہے۔ چرنجی پٹھان سے معافی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ بہت جلد اس کا قرضہ ادا کر دے گا۔ پٹھان چرنجی سے کہتا ہے کہ وہ ٹانگہ گھوڑا بیچ کر قرض ادا کر دے۔ اس سے چرنجی کو بہت صدمہ ہوتا ہے۔ ٹانگہ گھوڑا وہ کبھی بیچنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ وہ اُسے بہت عزیز ہے۔ اتنے میں کرشن کماری کی آواز آتی ہے "پتاجی میری کتابیں آپ ساتھ لے گئے ہیں نا" چرنجی اپنی لڑکی کو جواب دیتا ہے "ہاں بیٹا لے آیا ہوں اپنے ساتھ" یہ کہہ کر وہ پٹھان کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتا ہے اور کہتا ہے "خان۔ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میری لڑکی کے سامنے اپنے روپوں کا تقاضا نہ کرنا" خان کا دل کچھ پسیجتا ہے۔ چنانچہ جب کرشن کماری آتی ہے۔ اور ٹانگے میں بیٹھتی ہے تو وہ چرنجی سے کچھ نہیں کہتا۔ خان کو سلام کر کے چرنجی ٹانگہ چلاتا ہے۔

دیہاتی لڑکے کرشن کمار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ جگدیش نے اس کے پرانی وضع کے کوٹ کے ساتھ "فرشٹ ایر فول" کی چٹ لگا رکھی ہے جدھر سے وہ بیچارا گذرتا ہے۔ لڑکے اس کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں۔ کرشن کمار جب سب کو ہنستے دیکھتا ہے۔ تو خود بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

اس دوران میں چرنجی کا ٹانگہ اور ایک موٹر آتی ہے۔ موٹر میں سے ستیش اور اس کی بہن آشا نکلتی ہے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس نے کرشنا کماری

کا فارم ستیش کو دیا تھا اور کہا تھا " ان کو وہ جگہ بتا دو جہاں داخلہ ہو رہا ہے ۔" کرشنا کماری جب ستیش کی بہن نرملا کو دیکھتی ہے۔ تو پہچان کر نمستے کرتی ہے ۔ نرملا نمستے کا جواب دیتی ہے اور اپنے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے ۔" یہ میرے بھائی ستیش ہیں۔ مگر آپ کی ایک بار پہلے ملاقات ہو چکی ہے ۔" ستیش ہنسکر کہتا ہے ۔" آپ کبڈی کھیلتی ہیں کشتی لڑتی ہیں ۔ اور گولہ پھینکتی ہیں " کرشنا کماری اس روز کا واقعہ یاد کر کے شرما جاتی ہے ۔ مگر ساتھ ہی ہنس پڑتی ہے تینوں کالج کی طرف بڑھتے ہیں ۔ کچھ دور جاتے ہیں تو ایک شور سنائی دیتا ہے ۔

جگدیش اور اس کے ساتھیوں نے کرشن کمار کو کیچڑ بھرے گڑھے میں دھکا دے کر گرا دیا تھا کیچڑ میں بیچارا لت پت ہے ۔ لڑکے چھیڑ رہے ہیں ۔ جگدیش آگے بڑھ کر جب اُسے اٹھانے لگتا ہے ۔ تو اس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے ۔ کرشن کمار سے اب برداشت نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ یہ کوٹ اسے بے حد عزیز ہے ۔ یہ اس کے مرحوم باپ کا تھا ۔ جو اس کی ماں نے سنبھال کر اس کے لئے رکھا ہوا تھا ۔ جب اس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے تو وہ دیوانوں کی طرح اُٹھتا ہے اور جگدیش کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے ۔ کالج میں جگدیش کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ۔ کہ وہ بہت لڑاکا ہے ۔ کوئی اس کے مقابل میں نہیں ٹھہر سکتا ۔ مگر جب کرشن کمار اُسے بُری طرح لتاڑتا ہے تو سب لڑکے حیران رہ جاتے ہیں ۔ جگدیش اور

کرشن کمار دونوں کشتی لڑتے لڑتے ستیش ۔ کرشنا کماری اور نرملا کے پاس آجاتے ہیں ۔ تو زبردست گھونسا مار کر جب کرشن کمار ۔ جگدیش کو گراتا ہے تو بے اختیار کرشنا کماری کے منہ سے نکلتا ہے :۔ یہ کیا وحشیانہ پن ہے " کرشن کمار یہ آواز سُنتا ہے اور اپنا ہاتھ روک لیتا ہے ۔ ستیش جگدیش کو اُٹھا کر ایک طرف لے جاتا ہے ۔ اتنے میں گھنٹی بجتی ہے سب لوگ چلے جاتے ہیں ۔ صرف کرشن کمار اور کرشنا کماری اکیلے رہ جاتے ہیں ۔ دونوں چند لمحات خاموش کھڑے رہتے ہیں ۔ آخر میں کرشن کمار ندامت بھرے لہجے میں کرشنا کماری سے کہتا ہے :" مجھے معاف کر دو ۔ آئندہ مجھ سے کبھی ایسی وحشیانہ حرکت نہیں ہوگی کرشنا کماری اس کی سادگی سے بہت متاثر ہوتی ہے جب وہ اس سے کہتا ہے :" میں کسی سے کچھ نہیں کہتا ۔ لیکن یہ لڑکے میری طرف دیکھ دیکھ کر کیوں ہنستے ہیں ۔ کیوں چھیڑتے ہیں ۔ کیوں تنگ کرتے ہیں ۔ مجھے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے یہ میرا کوٹ پھاڑ دیا ہے جو میرے باپ کا ہے ۔" کرشنا کماری اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے ۔ اور اُسے بتاتی ہے کہ لڑکے اس کو صرف اس لئے چھیڑتے ہیں ۔ کہ اس کا لباس پرانی وضع کا ہے ۔ اگر وہ اس طرح کا لباس پہننا شروع کر دے ۔ جیسا کہ دوسرے کالج میں پہنتے ہیں ۔ تو اُسے کوئی نہیں ستائے گا ۔ کرشنا کماری کی باتیں کرشن کمار کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں ۔ جگدیش اور اس کے ساتھی جھاڑیوں کے پیچھے سے ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ لیتے ہیں ۔

ہوسٹل — کرشن کمار اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہے اور سوٹ کا معائنہ کر رہا ہے۔ اس دوران میں وہ ایک گانا گاتا ہے۔ بڑے جذبات بھرے انداز میں اس کے گانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔

ساتھ والے کمرے میں جگدیش ڈنر پیل رہا ہے۔ اور ڈمبل پھیر رہا ہے جب اسے گانے کی آواز آتی ہے تو وہ بہت حیران ہوتا ہے۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ساتھ والے کمرے میں کوئی گا رہا ہے باہر نکلتا ہے اور اس کمرے کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے "آ جاؤ" جگدیش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ کرشن کمار نیا سوٹ پہنے کھڑا ہے۔ جب دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ تو کرشن کمار کہتا ہے "آپ لڑنے آئے ہیں۔ تو مہربانی کر کے یہاں سے چلے جائیے۔ کیونکہ میں اب کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا" جگدیش مسکراتا ہے اور اپنے تیل لگے بدن کی طرف دیکھتا ہے۔ "نہیں نہیں میں لڑنے نہیں آیا۔ صلح کرنے آیا ہوں" یہ کہہ کر وہ اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ جسے کرشن کمار قبول کر لیتا ہے۔ اس کے بعد جگدیش اس کے گانے کی تعریف کرتا ہے۔ اور کہتا ہے "دوست! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل کو لگی ہے۔ آواز میں یہ درد ایسے ہی پیدا نہیں ہوا۔ ضرور کسی کی ترچھی نظر نے تمہیں گھائل کیا ہے" کرشن کمار بہت

سادہ لوح ہے۔ فوراً ہی اپنے دل کا راز جگدیش کو بتا دیتا ہے۔ "اب تم نے دوست کہا ہے تو تم سے کیا پردہ ہے۔ اس لڑکی کرشنا کماری نے ایسی پیاری پیاری باتیں کی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ بڑی شریف اور بڑی ہمدرد لڑکی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم لوگ مجھے کیوں چھیڑتے ہو۔ اب دیکھو اس کے کہنے پر ہی نے تین سوٹ بنوائے ہیں۔ جگدیش اس کا ہمراز بن جاتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے "تمہیں عشق ہو گیا ہے ـــ سمجھے ـــ یعنی تمہارا دل جو ہے نا وہ اس لڑکی پہ آگیا ہے۔ اب تمہیں یہ چاہیے کہ تم اس لڑکی پر اپنے عشق کا اظہار کر دو۔ اگر تم نے اپنی محبت کو اپنے پہلو میں دبائے رکھا تو اُسے زنگ لگ جائے گا۔ اور دیکھو، عورت کو اپنی طرف مائل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم اُسے کوئی تحفہ دو۔ انگوٹھی، بندے جھمکے، کچھ بھی" سادہ لوح کرشن کمار جگدیش کی یہ سب باتیں اپنے پلّے باندھ لیتا ہے۔

کالج کے بغیچے میں کرشنا کماری ایک بنچ پر بیٹھی ہے۔ کرشن کمار آہستہ آہستہ اس کے پاس جاتا ہے جس طرح جگدیش نے کہا تھا اس طرح وہ اس پر اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ بڑے خام انداز میں۔ اس کے بعد وہ اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالتا ہے اور کرشنا کماری کو سونے کے جھمکے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ کرشنا کماری یہ ڈبیا

غصے میں آکر ایک طرف پھینک دیتی ہے۔ کرشن کمار کو صدمہ پہنچتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بے حد سادہ لوح ہے۔ اس لئے وہ ساری بات کرشنا کماری کو بتا دیتا ہے "مجھے جگدیش نے کہا تھا۔ کہ دل میں کوئی بات نہیں رکھنی چاہیئے۔ مجھے کئی راتوں سے نیند نہیں آتی۔ میں ہر وقت تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ تم نے کیوں مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اگر میرے دل میں تمہارے لئے محبت پیدا ہوئی ہے تو یہ تمہارا قصور ہے میرا نہیں یہ جھمکے جو میں نے تمہیں دیئے ہیں۔ ان سے میری محبت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ تو مجھ سے جگدیش نے کہا تھا۔ کہ ایسے موقعوں پہ تحفہ ضرور دینا چاہیئے۔ میں تو اپنی ساری زندگی تمہیں تحفے کے طور پہ دینے کو تیار ہوں" جب کرشنا کماری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ کرشن کمار کی صاف گوئی سے متاثر ہوتی ہے۔ تو وہ جھمکوں کی ڈبیا اٹھا لیتی ہے اور اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے "مجھے تمہارا یہ تحفہ قبول ہے" کرشن کمار بہت خوش ہوتا ہے جھمکے لے کر کرشن کماری کچھ اور کہے سنے بغیر چلی جاتی ہے —— کرشن کمار چند لمحات خاموش کھڑا رہتا ہے اتنے میں جگدیش اور ستیش دونوں جھاڑیوں کے پیچھے سے نکلتے ہیں۔ اور کرشن کمار کو مبارکباد دیتے ہیں۔ کرشن کمار بہت جھینپتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ جگدیش سے کہتا ہے "مگر یار تم نے تو کہا تھا کہ میں یہ بات کسی اور کو نہیں بتاؤں گا" ستیش کی طرف دیکھ کر وہ پھر کہتا ہے "ان کو بھی پتہ لگ گیا ہے" جگدیش۔ کرشن کمار کو تسلی دیتا ہے کہ ستیش اپنا

آدمی ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہنے لگا۔ چنانچہ ستیلش بھی کرشن کمار کو ہر ممکن تسلی دیتا ہے۔ کہ وہ اس کے عشق کا راز کسی کو نہیں بتلائے گا۔

طویلے میں چرنجی ساز پالش کر رہا ہے۔ ٹانگے کی پیتل کی چیزیں پالش کر رہا ہے ـــــ گھوڑے کو مالش کر رہا ہے۔ جب گھوڑے کو مالش کرتا ہے تو اس سے پیار محبت کی باتیں کرتا ہے۔ ـــ "دوست تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو جانے زندگی کیسے کٹھن ہو جاتی ـــ تم نے اور میں نے دونوں نے مل کر منی کو پڑھایا ہے۔" اتنے میں اس کے دو تین دوست جو ٹانگے والے ہیں آتے ہیں۔ ان میں سے ایک چرنجی سے کہتا ہے "یہ تم گھوڑے سے کیا باتیں کر رہے ہو۔ جیسے یہ سب کچھ سمجھتا ہے۔" چرنجی گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے "انسانوں سے حیوانوں کی دوستی اچھی میرے بھائی۔ انہیں کوئی ورغلا تو نہیں سکتا۔ غلام محمد تیری جان کی قسم سچ کہتا ہوں۔ اس جانور نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ ٹانگے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے جوتے رکھا ہے غریب کو ـــ" اتنے میں پٹھان آتا ہے چرنجی اس کو سلام کرتا ہے اور اپنے تہمد کے ڈبے سے نوٹ نکالتا ہے اور کہتا ہے "خاں صاحب! یہ ہے آپ کے سو روپے کھرے کر لیجئے۔ باقی رہے سو۔ سو اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا ـــ یہ میرا گھوڑا سلامت رہے۔" یہ کہکر وہ بڑے فخر سے اپنے گھوڑے کی طرف دیکھتا ہے۔ پٹھان نوٹ لے کر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ٹانگے والا چرنجی سے کہتا ہے "تم تو لگی

کو پڑھانا شروع کرکے خواہ مخواہ ایک جنجال میں پھنس گئے ہو۔ کوئی نہ کوئی قرض خواہ تمہارے پیچھے لگا ہی رہتا ہے؟" پھر نجی ہنستا ہے۔ "سب سے بڑی قرض خواہ میری بیٹی ہے۔ اس کا قرض ادا ہو جائے تو ایسے لاکھ قرض لینے والے میرے پیچھے پھرتے رہیں مجھے کوئی پروا نہیں —— تم میں سے کوئی افیم کا نشہ کرتا ہے کوئی شراب کا مجھے بھی ایک نشہ ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میری لڑکی دولت مند کا ذ۔ رں کی لڑکیوں کی طرح پڑھ لکھ رہی ہے۔ تو میرا دل و دماغ ایک عجیب نشے سے جھومنے لگتا ہے —— عورت کو ضرور تعلیم حاصل کرنی چاہیے میرے بھائی۔ اس کے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں؟" یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو تھپکی دیتا ہے اور خوش خوش باہر نکلتا ہے تاکہ گھر جائے۔

اندر آئینہ سامنے رکھے کرشنا کماری اپنے کانوں میں کرشن کمار کے دیئے ہوئے جھمکے پہنے بیٹھی ہے۔ اور انہیں پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ گیت گا رہی ہے۔ اور جیسے بے خودی ہو رہی ہے۔ جھمکے اسے بہت پسند آتے ہیں۔ اس پسندیدگی کا اظہار اس کی ہر حرکت سے معلوم ہوتا

پھر نجی آتا ہے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ گانے کی آواز سنتا ہے!

کرشنا کماری بدستور گانے میں مشغول ہے —— دفعتہً پاگلوں کی

طرح چرنجی اندر داخل ہوتا ہے کرشنا کماری ایک دم گانا بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ چرنجی آگے بڑھتا ہے۔ زور سے کرشنا کماری کے دونوں ہاتھ نیچے جھٹک دیتا ہے۔ قریب ہے کہ جھمکوں کو اس کے کانوں سے نوچ لے۔ کرشنا کماری خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی جاتی ہے چرنجی پاگلوں کی طرح اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور چلانا شروع کر دیتا ہے "کہاں سے لئے ہیں تو نے جھمکے بتا۔ کہاں سے لئے ہیں تو نے یہ جھمکے" وہ اس قدر زور سے چلاتا ہے کہ ایک دم اُسے چکر آتا ہے۔ وفور جذبات سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا ہے اس کی بلند آواز بالکل دھیمی ہو جاتی ہے "کہاں سے لئے ہیں تو نے یہ جھمکے" سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی لڑکی فوراً پنکھا لے کر جھلنا شروع کر دیتی ہے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ ایک گلاس پانی مانگتا ہے۔ کرشنا کماری اس کو پانی پلاتی ہے۔ پانی پینے کے بعد وہ کرشنا کماری سے پھر پوچھتا ہے "منی۔ یہ جھمکے تو نے کہاں سے لئے ہیں؟" کرشنا کماری تھوڑے سے توقف کے بعد ذرا لکنت کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیتی ہے "کالج کی ایک سہیلی نے دیئے ہیں" چرنجی اپنی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے "اپنی سہیلی کو واپس دے آؤ" لڑکی پوچھتی ہے "کیوں پتا جی؟" چرنجی جواب دیتا ہے "تمہاری ماں کو یہ زیور پسند نہیں تھا" یہ کہہ کر وہ اُٹھتا ہے اور بیماروں کی طرح قدم اٹھاتا باہر چلا جاتا ہے۔ اس کی لڑکی اس سے پوچھتی ہے "کھانا

نہیں کھائیں گے آپ؟" چرنجی جواب دیتا ہے۔ "نہیں۔"

باہر نکل کر چرنجی گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے اور تانگہ چلاتا ہے مخاطب کرکے اس سے کہتا ہے۔ "آج میری لڑکی نے پہلی بار جھوٹ بولا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے اور تانگہ چلاتا ہے۔ افسردگی کے عالم میں وہ تانگے پر کئی بازاروں کا چکر لگاتا ہے۔ حتیٰ کہ رات ہو جاتی ہے۔۔۔ ایک نیم روشن بازار میں سے اس کا تانگہ گزر رہا ہے کہ اچانک ایک عورت چند مردوں کی جھپٹ سے نکل کر تیزی سے چرنجی کے تانگے کی جانب بڑھتی ہے۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بھاگتی تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ عورت شراب کے نشے میں چور ہے۔ زیورات سے لدی ہوئی ہے۔ تانگے میں بیٹھتے ہی وہ چرنجی سے باتیں شروع کر دیتی ہے۔ "مجھے چھیڑتے تھے اُلّو کے پٹھے۔ پورے دام لئے بغیر کسی کو ہاتھ لگانے دیتی ہوں۔۔۔ کیوں تانگے والے تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ دنیا میں پیسہ ہی تو ہے۔ تم کچھ بولتے نہیں۔۔۔ مجھے یاد آیا۔ میرا پتی ایک تانگے والا ہی تھا پر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے۔ کہ مجھے نگوڑے جھمکے لا دیتا۔ لیکن اب دیکھو میری۔ یہ کڑے، یہ گلوبند، یہ انگوٹھیاں، ایک سے ایک بڑھکر۔" یہ کہہ کر وہ دکھ بھرے انداز میں ہنستی ہے۔ "عصمت کا گہنا اتر جائے۔ تو یہ زیور تو پہننے ہی چاہئیں۔"

چرنجی پہچان لیتا ہے کہ یہ عورت کون ہے؟ — اس کی بیوی تھی جو اس حالت کو پہنچ چکی تھی۔ چرنجی کمبل سے اپنا چہرہ قریب قریب چھپا لیتا ہے۔ اس پر طوائف اس سے کہتی ہے: "تم کیوں اپنا چہرہ چھپاتے ہو۔ چھپانا تو مجھے چاہیے۔ یہ چہرہ جس پر کتنی پھٹکاریں پڑی ہیں" یہ کہہ کر وہ پھر ہنستی ہے: "تم خاموش کیوں ہو؟ — تانگہ روک دو۔ میرا گھر آ گیا ہے" چرنجی تانگہ روک دیتا ہے۔ طوائف پائدان پر پیر رکھ کر اترنے لگتی ہے کہ لڑکھڑا کر گرتی ہے اوندھے منہ۔ چرنجی دوڑ کر اسے اٹھاتا ہے — طوائف ہنستی ہے: "گرتے والوں کو اٹھایا نہیں کرتے میری جان" یہ کہہ کر جب وہ گھر کی طرف چلنے لگتی ہے۔ تو لڑکھڑا کر پھر گرتی ہے۔ چرنجی اس کو تھام لیتا ہے۔ اور اس کو اس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے۔ جب چلنے لگتا ہے تو طوائف اس کو کرایہ دیتی ہے — چرنجی کرایہ لے لیتا ہے طوائف اس کا بازو پکڑ کر اندر گھسیٹتی ہے اور کہتی ہے: "آؤ میری جان آؤ۔ آج کی رات میرے مہمان رہو — میں تم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی — آؤ شراب کی پوری بوتل پڑی ہے اوپر... آؤ..."

چرنجی تانگے میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے — طوائف ہنستی ہے اور کہتی ہے: "بیوقوف کہیں کا — مفت کی تو قاضی بھی نہیں چھوڑتا۔"

چرنجی گھر پہنچتا ہے۔ جب اندر داخل ہوتا ہے تو اسے رونے کی آواز

سنائی دیتی ہے۔ کمرے میں جا کر دیکھتا ہے کہ اس کی لڑکی بستر پر اوندھے منہ لیٹی ہے اور زار زار رو رہی ہے۔ چرنجی اس کے پاس جاتا ہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور رونے کا سبب پوچھتا ہے۔ اس کی لڑکی اور زیادہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ جب چرنجی دوسری بار اس سے رونے کا سبب پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے:" مجھے ماں یاد آ رہی ہے " اگر وہ آج زندہ ہوتیں۔ تو میں . . . . . . میں . . . ." وہ اس کے آگے کچھ نہیں کہہ سکتی اور اپنے باپ کے پیر پکڑ کر کہتی ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے پتا جی ـــــ میں نے آج آپ سے جھوٹ بولا ہے " چرنجی کہتا ہے " مجھے معلوم ہے " اس پر اس کی لڑکی کہتی ہے " اگر آج میری ماتا جی ہوتیں۔ تو میں نے یہ جھوٹ کبھی نہ بولا ہوتا ـــ بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ جو لڑکیاں صرف اپنی ماؤں کو ہی بتا سکتی ہیں " چرنجی اپنی لڑکی کو اٹھاتا ہے اور اپنے پاس بٹھاتا ہے " میں تمہاری ماں ہوں ـــ بولو کیا بات ہے ـــــ شرماؤ نہیں ـــــ " کرشنا کماری جھینپ جاتی ہے اور شرما کر کہتی ہے " یہ جھمکے مجھے کالج کے ایک لڑکے نے دیئے ہیں پتا جی! وہ بہت ہی اچھا ہے " یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے کے باہر نکل جاتی ہے سسکیاں لیتی ہوئی ـــــ چرنجی بستر پر پڑے ہوئے جھمکوں کو اٹھاتا ہے اور ان کی طرف دیکھتا ہے۔

چرنجی کا تانگہ کالج کے دروازے میں داخل ہوتا ہے۔ کرشنا کماری

اپنی کتابیں لے کر نیچے اُترتی ہے۔ چرنجی اپنی جیب سے جھمکوں کی ڈبیا نکالتا ہے اور اپنی لڑکی کو دے کر کہتا ہے "اسے آج واپس کر دینا"۔ کرشنا کماری ڈبیا لے کر خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی وہ کالج کے بغیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ بغیچے میں ایک بنچ پر کرشن کمار بیٹھا ہے۔ اور ایک خط پڑھ رہا ہے۔ کرشنا کماری کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس سے باتیں شروع کر دیتا ہے "ماتا جی کا خط آیا ہے — لو پڑھو — نہیں ٹھہرو۔ میں پڑھ کے سناتا ہوں — پر تم ہنسنا نہیں — میری ماں بیچاری سیدھی سادھی دیہاتن ہے۔ میں نے اُن کو تمہاری بابت لکھا ہے۔ میں ان سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھا کرتا۔ سنو انہوں نے کیا لکھا ہے — بیٹا کمار — ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ جس سے اس لڑکی کی بدنامی ہو۔ اس کے ماں باپ سے ملو اور کہو جیسی وہ ان کی بیٹی ہے۔ ویسے ہی تم اُن کے بیٹے ہو۔ میری طرف سے اس کو اشیرواد دینا۔ تم جاگ جاگ جیو...... اور باقی احوال یہ ہے کہ میں نے خالص گھی کی اپنے ہاتھ سے یہ مٹھائی بنائی ہے جو تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اس میں سے آدھا حصہ تمہاری کرشنا کماری کا ہے۔ کہنا تمہاری ماتا جی نے بھیجا ہے —" کرشنا کماری دم بخود یہ باتیں سنتی رہتی ہے کرشن کمار اس رو میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور کرشنا کماری کو موقعہ ہی نہیں ملتا۔ کہ وہ کچھ کہہ سکے "دیکھا میری ماں کتنی سیدھی سادھی ہے۔ انہوں نے جو مٹھائی بھیجی ہے بالکل خراب

تھی۔ پر میں ساری کی ساری کھا گیا ہوں ۔۔۔ کیا کرتا اگر نہ کھاتا۔ تو ناراض ہو جاتیں ۔۔۔ میں بھی بالکل ان جیسا ہوں۔ اگر تم نے اس روز میرا تحفہ قبول نہ کیا ہوتا۔ تو میرا دل ٹوٹ جاتا۔ جانے میں کیا کر بیٹھتا!" کرشنا کماری کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر گلے میں اس کی آواز رونده جاتی۔ جھمکے واپس دینا چاہتی ہے مگر نہیں دے سکتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ ایک دم تیزی سے مڑتی ہے۔ اور کرشن کمار کو وہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

کرشنا کماری تیزی سے جا رہی ہے۔ کہ اس کی مڈبھیڑ جگدیش اور ستیش سے ہوتی ہے۔ دونوں اس کی طرف غور سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ کرشنا کماری چلی جاتی ہے جگدیش اور ستیش ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس طرف بڑھتے ہیں۔ جدھر کرشن کمار بیٹھا ہے۔

جگدیش اور ستیش دونوں کمار سے ملتے ہیں۔ جگدیش اس سے کہتا ہے "کمار، تم نے یہ کیا غضب کر دیا ہے۔ بیچاری رو رہی تھی۔ بھئی یہ رومانس اچھا رہا۔ مارا وارا تو نہیں تم نے؟" کرشن کمار سادہ لوحی کے ساتھ مسکراتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "ایک خاص بات تھی"۔ جگدیش اس سے یہ خاص بات دریافت کرتا ہے تو کرشن کمار کہتا ہے

"ایک خاص بات تھی"۔ جگدیش اس سے یہ خاص بات دریافت کرتا ہے تو کرشن کمار کہتا ہے "یہ بھی سب باتیں میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ کہہ جو دیا ایک خاص بات تھی"۔ یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے۔ جگدیش اور ستیش دونوں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ دونوں بنچ پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کرشنا کماری کے متعلق باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ جگدیش کہتا ہے۔ "میں سمجھتا ہوں فلرٹ ہے۔ اس کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تانگے والے سے بات چیت کی جائے۔ وہ اس کے سارے بھید جانتا ہوگا۔ باہر ہی باہر معاملہ طے ہو جائے گا۔ اور یہاں کالج میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی"۔ ستیش کو یہ بات پسند آتی ہے۔ چنانچہ طے ہوتا ہے کہ جگدیش تانگے والے سے بات چیت کرے۔

چرنجی کالج کے باہر تانگہ لئے کھڑا ہے۔ پاس ہی سگرٹ پان والے کی دوکان ہے۔ یہاں جگدیش کھڑا ہے پان والے سے پان اور سگریٹ لیتا ہے اور چرنجی کی طرف بڑھتا ہے۔ گھوڑے کو تھپکی دیتا ہے اور پھر اس کی تعریف کرتا ہے اس طرح وہ چرنجی سے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ آخر میں وہ باتوں باتوں میں چرنجی سے کہتا ہے "استاد عیش کرتے ہو۔ ہر روز ایک بیٹا تہ سی لونڈیا اس تانگے میں بٹھا کر لاتے ہو اور لے جاتے ہو ——— اچھا میں نے کہا۔ کچھ ہماری دال گل سکتی ہے۔ اور استاد تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو ——— تمہارے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ایسا ہی

ایک ٹانگہ گھوڑا بن جائے گا۔ اگر ہمارا کام ہو جائے۔" چرنجی ہنستا رہتا ہے۔ جگدیش کو اور شہ ملتی ہے "اماں ہم سب جانتے ہیں کہ لونڈیا ایسی نہیں کہ ہاتھ نہ آسکے۔ کالج میں اس کا ایک لڑکے سے سلسلہ جاری ہے۔" چرنجی اب کچھ دلچسپی لیتا ہے اور جگدیش سے چند باتیں دریافت کرتا ہے۔ جگدیش اُسے بتاتا ہے کہ اس لڑکی کرشنا کماری پہ کالج میں ایک لڑکا جو بہت بدمعاش ہے ڈورے ڈال رہا ہے چنانچہ اس لڑکے سے وہ کانوں کے جھمکے بھی لے چکی ہے۔ یہ سب باتیں بتانے کے بعد جگدیش چرنجی سے کہتا ہے "دیکھو اگر اس کو زیوروں ہی کا شوق ہے۔ تو ہم بڑھیا سے بڑھیا چیز دے سکتے ہیں۔ تم یہ باتیں اپنے طور سے اُس کے ساتھ کرنا۔ سمجھے۔" اس قسم کی چند باتیں ہونے کے بعد طے ہوتا ہے۔ کہ جگدیش شام کو کمپنی باغ کے پاس فلاں فلاں مقام پر چرنجی کا انتظار کرے۔ جب لڑکی چھٹی پان جانے والی ہے۔ تو چرنجی سارا معاملہ ٹھیک کر دے گا۔

اسی روز شام کو جگدیش مقررہ جگہ پہ پہنچ جاتا ہے۔ کھمبے کے ساتھ کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔ اتنے میں عین وقت پر چرنجی کا ٹانگہ سڑک پر نمودار ہوتا ہے۔ چرنجی کھمبے کے پاس اپنا ٹانگہ روکتا ہے جگدیش بہت خوش ہو کر چرنجی سے کہتا ہے "بھئی بالکل انگریز ہو۔ ٹھیک وقت پہ آئے ہو۔ نہ ایک منٹ اِدھر نہ ایک منٹ اُدھر۔"

چرنجی مسکراتا ہے اور کہتا ہے "اب آپ وقت ضائع نہ کیجئے اور بیٹھ جایئے ٹانگے میں آپ کو سیدھا رستہ بتا دوں " جگدیش خوش خوش ٹانگے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور چرنجی کو ایک سگریٹ پیش کرتا ہے۔ ٹانگہ چلتا ہے۔

ٹانگہ چلتا ہے۔ جگدیش۔ چرنجی کے ساتھ لڑکی کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ٹانگہ مختلف سڑکیں طے کرنے کے بعد ایک ویران سی جگہ پہ پہنچتا ہے چرنجی باگیں کھینچ کر گھوڑا ٹھہراتا ہے۔ بڑے اطمینان سے اپنا کمیض اور پگڑی اتار کر اگلی نشست پہ رکھتا ہے اور آستینیں چڑھا کر جگدیش سے کہتا ہے" آیئے آپ کی لڑکی سے ملاقات کرا دوں " جگدیش چرنجی کی طرف شک کی نظروں سے دیکھتا ہے مگر چرنجی اس کا بازو پکڑتا ہے۔ اور کھینچ کر جھاڑیوں کے پیچھے لے جاتا ہے۔ چند لمحات کے بعد جگدیش کا ہیٹ اچھلتا باہر سڑک پہ آگرتا ہے۔

کالج کا ہوسٹل ــــ جگدیش کا کمرہ۔ باہر دروازے پر جگدیش کا نام پیتل کے بورڈ پہ لکھا ہوا ہے۔ ستیش آتا ہے اور دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ ستیش اندر داخل ہوتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جگدیش کا سر نہ سوجا ہوا ہے اور کئی پٹیاں اس کے جسم پہ بندھی ہیں۔ ستیش اس سے پوچھتا ہے" یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ " جگدیش اُسے کرسی پہ بٹھاتا ہے اور سارا قصہ سناتا ہے " بھئی یہ تو برسوں کی دوستی

کام آگئی۔ ورنہ نیندرے کا تو کل کام تمام ہو گیا ہوتا۔ میں نے ٹانگے والا سے تمام معاملہ طے کر لیا۔ چنانچہ وہ مجھے کمپنی باغ میں ملا۔ لڑکی وہاں موجود تھی اس سے باتیں بھی ہوئیں۔ لیکن ستیش اس کے وہاں تین چار اور چاہنے والے آ گئے۔ مجھے اس کے ساتھ دیکھکر جل ہی تو گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ پر کوئی ریمارک کسا۔ لڑکی میرے ساتھ تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ جگدیش یہاں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اُٹھا۔ ایک ایسا گھونسا اس سالے کی ٹھڈی کے نیچے جمایا کہ دن کو تارے ہی نظر آ گئے ہوں گے بچہ جی کو۔ بس پھر کیا تھا۔ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ — چاروں مجھ پر پل پڑے مگر ستیش میں نے بھی وہ ہاتھ دکھلائے کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ ایک ایک کو فرش کر کے رکھ دیا — کچھ چوٹیں مجھے بھی آ گئیں" ساتھ والے کمرے میں یہ سب باتیں کرشن کمار سنتا رہتا ہے۔ کیونکہ دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کا ایک پردہ ہے جو اوپر سے خالی ہے — ستیش جگدیش کی سب باتیں سن کر کہتا ہے۔ اور جواب دیتا ہے "بھائی ایسے موقعوں پر کون کس کی مدد کرتا ہے — تم کیا بچوں ایسی باتیں کرتے ہو" — اتنے میں جگدیش کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور کرشن کمار غصے میں بھرا ہوا داخل ہوتا ہے اور جگدیش سے کہتا ہے تم نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ ہے۔ تم ایک شریف لڑکی پر بہتان باندھ رہے ہو" جگدیش ہنستا ہے اور کہتا ہے "میرا جرم نکل گیا ہے اور تم کہتے ہو بہتان باندھ رہا ہوں — یقین نہ ہو تو ٹانگے والے سے پوچھ لو جو مجھے لے گیا تھا" غصے میں آ کر چونکہ اس کی محبوبہ

کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے۔ کرشن کمار زور سے ایک چانٹا جگدیش کے منہ پر مارتا ہے اور کہتا ہے: "بکواس مت کرو" لیکن فوراً ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے: "مجھے معاف کر دو جگدیش۔ یہ چانٹا تمہارے منہ پہ نہیں مجھے اس ٹانگے والے کے منہ پر مارنا چاہیے تھا۔ جو اس کی زندگی تباہ کر رہا ہے" یہ کہکر وہ چلا جاتا ہے

کرشن کمار اپنے کمرے میں آتا ہے۔ میز پہ بیٹھتا ہے۔ کاغذ لے کر خط لکھنا شروع کرتا ہے۔ مگر چند سطریں لکھکر ہی کاغذ پھاڑ دیتا ہے — کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کمرے میں اضطراب کے ساتھ اِدھر اُدھر زور سے ٹہلتا ہے۔ سامنے کھونٹی پر اپنا سوٹ دیکھتا ہے۔ اُسے اتار کر اپنے پیروں میں روندتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تو پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ جاتا ہے — پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جاکر درد بھری دُھن میں کوئی گیت گاتا ہے۔

چرنجی کھانا کھا رہا ہے۔ پاس ہی اُس کے اس کی لڑکی بیٹھی ہے۔ چرنجی مُنہ میں نوالہ ڈالنے ہی والا ہوتا ہے۔ کہ اُسے کوئی بات یاد آتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی لڑکی سے پوچھتا ہے: "منی تم نے جھمکے واپس کرد ے —" کرشنا کماری جھوٹ نہیں بولتی: "پتاجی۔ میں اس کو واپس دینے گئی پر دے نہ سکی" چرنجی نوالہ وہیں تھال میں رکھ دیتا ہے۔ اور پوچھتا ہے: "کیوں؟" — کرشنا کماری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ صرف اتنا کہہ سکتی ہے: "مجھے معلوم نہیں" — چرنجی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور کھانا کھائے بغیر باہر چلا جاتا ہے۔

ایک آدمی عینک لگائے ڈیسک کے ساتھ بیٹھا ہے۔ چرنجی سے کہتا ہے "یہاں انگوٹھا لگاؤ"۔ چرنجی اپنا انگوٹھا آگے بڑھا دیتا ہے۔ اس پر وہ آدمی سیاہی لگاتا ہے اور پکڑ کر کاغذ پر جما دیتا ہے۔ انگوٹھا لگوانے کے بعد وہ ڈیسک سے نوٹ نکالتا ہے اور چرنجی کے حوالے کر دیتا ہے۔ چرنجی خاموش یہ نوٹ لے کر باہر نکلتا ہے۔

باہر ایک شیڈ کے نیچے اس کا تانگہ گھوڑا کھڑا ہے۔ چرنجی اپنے انگوٹھے کی سیاہی دیکھتا اس کی جانب بڑھتا ہے۔ ایک ہاتھ میں اس نے نوٹ پکڑے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ گھوڑے کے پاس جاتا ہے۔ اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر گلوگیر آواز میں کہتا ہے "بیچ آیا ہوں تجھے دوست ...... یہ دیکھ اپنی قیمت" یہ کہہ کر وہ گھوڑے کے منہ کے آگے اپنا وہ ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ جس میں نوٹ ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ "لوگ اپنا ایمان بیچتے ہیں — میں تجھے بیچ آیا ہوں۔ تو جو کہ میرا سچا دوست تھا" آواز چرنجی کے گلے میں رُندھ جاتی ہے — "تو بول نہیں سکتا۔ اگر تیری زبان ہوتی۔ تو میں تیرے منہ سے سُنے بغیر کبھی نہ جاتا۔ کہ چرنجی، تو جھوٹا ہے، مطلبی ہے دغاباز ہے۔ جس طرح وقت پڑنے پر لوگ گلے کا کنٹھا۔ انگلی کی انگوٹھی بیچ دیتے ہیں۔ اس طرح تو نے مجھے بیچ دیا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر" یہ کہہ کر وہ اپنا انگوٹھا دیکھتا ہے اور گھوڑے سے کہتا ہے "یہ سیاہی دیکھی تو نے۔ یہ اس سودے کی کالک ہے۔ مگر میں تیرے ساتھ کیوں باتیں کر رہا ہوں — تو اب میرا نہیں۔ مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں ہا" — آخری بار چرنجی منہ پرے کر

کے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے اور تیز قدمی سے باہر چلا جاتا ہے۔

رات کا وقت ہے۔ چرنجی کمبل اوڑھے پیدل چلا آ رہا ہے۔ راستے میں ایک تانگے والا تانگہ ٹھہرا کر اس سے پوچھتا ہے۔" آج تانگہ گھوڑا نہیں جوتا چرنجی۔" چرنجی جواب دیتا ہے۔" آج نہیں جوتا۔ میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔" یہ کہہ کر وہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔

گھر میں چرنجی کی لڑکی کرشنا کماری لالٹین جلائے انتظار کر رہی ہے کبھی اُٹھتی ہے کبھی بیٹھتی ہے اسے کسی پہلو چین نہیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے وہ اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ چرنجی اندر داخل ہوتا ہے۔ کرشنا کماری اس سے پوچھتی ہے۔" پتا جی! آج آپ اتنی دیر سے آئے ہیں۔ کہاں چلے گئے تھے۔" چرنجی اپنے کمبل میں سے ایک پوٹلی نکالتا ہے اور اُسے کھول کر اپنی لڑکی کو دیتا ہے۔" یہ زیور لانے گیا تھا تیرے لئے ۔۔۔ تجھے شوق جو ہے ان کا۔ اب تو تیرا دل نہیں للچایا کرے گا۔ تو کہے گی تو میں تجھے ایسے اور زیور بھی لا دوں گا۔ اپنا آپ بھی بیچ ڈالوں گا۔ لیکن تیرے دل میں للچاہٹ نہیں پیدا ہونے دوں گا۔" کرشنا کماری کبھی زیوروں کی طرف دیکھتی ہے۔ اور کبھی اپنے باپ کی طرف۔ آخر میں کہتی ہے۔" کوئی چیز بیچی ہے آپ نے یہ گہنے خریدنے کے لئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے زیور فرش پر گر پڑتے ہیں۔" پتا جی میں نے کبھی ان چیزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے ان کا شوق ہے۔" چرنجی اس سے کہتا ہے۔" تو نے وہ جھمکے واپس کیوں نہیں کئے ۔۔۔" کرشنا کماری کی

آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں "کاش! میری ماتاجی زندہ ہوتیں جو میری بات سمجھ سکتیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں سونے چاندی کیلئے اپنا آپ بیچ دوں گی۔ آپ نے مجھے تعلیم دی ہے۔ میرے قدم مضبوط ہیں پتاجی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں

آپ نے مجھے تعلیم دی ہے۔ میرے قدم مضبوط ہیں پتاجی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں

آپ نے میرا نہیں اپنا اپمان کیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ روتی روتی پاس پڑے ہوئے صندوقچے سے جھمکوں کی ڈبیا نکالتی ہے اور اپنے باپ کو دے کر کہتی ہے "لیجئے یہ جھمکے جس نے مجھے دیئے تھے اس کو آپ ہی واپس دے آیئے۔ اگر آپ نہیں گئے تو میں اس کی یاد کو بھی اپنے دل سے نکال آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی" یہ کہہ کر وہ روتی روتی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ چرنجی فرش پر پڑے ہوئے زیوروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔

کالج کا صدر دروازہ۔ کرشن کمار خاموش دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے۔ اس کی نظریں دروازہ پر جمی ہوئی ہیں۔ جگدیش اور ستیش آتے ہیں۔ ستیش اس سے پوچھتا ہے "بڑی دیر سے یہاں خاموش کھڑے ہو۔ کیا بات ہے؟" کرشن کمار ایک عزم کے ساتھ جواب دیتا ہے "اس بدمعاش ٹانگے والے کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج اس کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔" جگدیش کرشن کمار کو ٹانگے والے کے خلاف اور زیادہ مشتعل کرتا ہے۔ دفعتاً سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھتی ہیں ٹانگے والا چرنجی اور کرشنا کماری دونوں پیدل اندر داخل ہوتے ہیں۔ جگدیش یہ دیکھ کر کہتا ہے "آج ٹانگہ کہاں گیا؟" اور کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر چرنجی اپنی لڑکی کو کتابیں

دیتا ہے۔ کرشنا کماری دور سے کرشن کمار کو دیکھتی ہے اور اس کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے: "پتا جی وہ لڑکا ہے جو ننگے سر کھڑا ہے۔" چرنجی سر ہلا دیتا ہے۔ کرشن کمار کرشن کماری کا اشارہ دیکھ لیتا ہے — کرشنا کماری ایک طرف چلی جاتی ہے کرشن کمار غصے میں بھرا سیدھا ٹانگے والے کی طرف بڑھتا ہے۔ چرنجی بھی اس کی طرف آ رہا ہوتا ہے۔ چرنجی کے پاس پہنچ کر کرشن کمار نہ آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ۔ کھینچ کر ایک چانٹا چرنجی کے منہ پر مارتا ہے۔ اور کہتا ہے: "کیا اشارے ہو رہے تھے۔ میری طرف ۔ کیا مجھے بھی تم اپنے جیسا بدمعاش سمجھتے ہو۔" ایک اور چانٹا وہ چرنجی کے منہ پر جما دیتا ہے: "اُلو کے پٹھے۔ شرم نہیں تجھے۔ پرائی لڑکیوں کو بُرے رستے پر لگاتے ہو۔ کیا تیری کوئی لڑکی نہیں۔ جو پیسے کے لالچ میں آ کر بھڑوے بنے ہوئے ہو۔" چرنجی کے منہ سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے۔ کرشن کمار یہ سمجھ کر کہ وہ اسے مارنا چاہتا ہے۔ گھونسے بازی شروع کر دیتا ہے چرنجی اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے۔ کرشن کمار گھونسے چلاتا رہتا ہے۔ اتنے میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جن میں جگدیش بھی شامل ہے۔ ایک دو پٹیاں ابھی تک اس کے سر پر بندھی ہوئی ہیں۔ کرشنا کماری چیختی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور کرشن کمار سے کہتی ہے: "کمار — تم یہ کیا کر رہے ہو — یہ میرے پتا جی ہیں۔" کرشن کمار متحیر ہو کر کہتا ہے — "پتا جی؟" چرنجی کے منہ سے خون جاری ہے وہ مسکراتا ہے: "ہاں بیٹا! میں اس کا پتا ہوں —— تمہارا بھی ——!" یہ کہہ کر وہ کرشن کمار کو سینے کے ساتھ لگا لیتا ہے: "جیتے رہو —— میں نے تم سے مار کھا لی ہے۔ لیکن اس جوان سے پوچھو" کہ وہ جگدیش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

کہ میرے بازوؤں میں کتنا بل ہے۔" جگدیش وہاں سے کھسک جاتا ہے ۔۔۔ کرشن کمار ندامت بھرے لہجے میں چرنجی سے معافی مانگتا ہے ۔۔۔ اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پہ پیار کا ہاتھ پھیر کر چرنجی جیب سے ٹھمکوں کی ڈبیا نکالتا ہے۔ اور کرشنا کماری کو دے کر کہتا ہے:" لو اسے اپنے پاس رکھو۔

شہنائیاں بج رہی ہیں۔ کرشنا کماری اور کرشن کمار کی شادی ہو چکی ہے۔ چرنجی اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پہ شفقت کا ہاتھ پھیر رہا ہے ۔۔۔ اپنی لڑکی سے کہتا ہے:" تم اپنی ماں کو یاد کیا کرتی تھیں ۔۔۔ تمہیں ماں بھی مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرشن کمار کی ماں کی طرف دیکھتا ہے جو ایک سیدھی سادی دیہاتن ہے۔ وہ مسکراتی ہے اور کرشنا کماری کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے۔ اور بڑی سادہ لوحی کے ساتھ کہتی ہے:" بیٹی میں نے تیرے لئے اپنے ہاتھ سے مٹھائی بنا کر بھیجی تھی۔ کیا تو نے کھائی تھی؟" کرشنا کماری ذرا جھینپ کر کہتی ہے:" کھائی تھی ماتا جی۔ بہت ہی مزے دار تھی۔"

ایک تانگے میں چرنجی کی بیوی شراب کے نشے میں دھت بیٹھی ہے۔ تانگہ چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرد بیٹھا ہے۔ چرنجی کی بیوی پان تھوک دیتی ہے۔" بہت بدمزہ ہے۔" اتنے میں تانگہ وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں کرشنا کماری اور کرشن کمار کی شادی ہو رہی ہے۔ تانگے والا تانگہ ٹھہرا دیتا ہے اور اپنے گاہک سے کہتا ہے:" معاف کیجئے گا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔" چرنجی کی بیوی

پوچھتی ہے :"کہاں جا رہے ہو تم؟" ـــ تانگے والا کہتا ہے :" چرنجی ٹانگے والے
کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے ۔ میں اسے مبارک باد دے آؤں ۔ یوں چٹکیوں
میں آیا۔" یہ کہہ کر ٹانگے والا چلا جاتا ہے ـــ چرنجی کی بیوی چند لمحات کے
لئے پتھر کی مورتی سی بن جاتی ہے ۔ لیکن لڑکھڑاتی ہوئی اٹھتی ہے اور ٹانگے
سے اتر کر ادھر جاتی ہے ۔ جہاں سے شہنائیوں کی آواز آتی ہے ۔ بارش ہو
رہی ہے ۔ چرنجی کی بیوی جو شراب کے نشے میں مدہوش ہے ۔ لڑکھڑاتے ہوئے
قدموں سے شادی منڈل کی طرف بڑھتی ہے ۔ بارش ہو رہی ہے ۔ باہر
تماشائیوں کے ساتھ کھڑی ہو کر وہ دولہا دلہن کو دیکھتی ہے ۔ اچھی طرح دیکھنے
کے لئے جب وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو ایک آدمی اسے پیچھے ہٹا دیتا
ہے اور کہتا ہے :" ارے کیا دیکھ رہی ہے تو ـــ تیری ماں نے کبھی شادی
نہیں کی ہوگی ۔" چرنجی کی بیوی اس آدمی سے جھگڑنا شروع کر دیتی ہے :"
میں ماں ہوں ـــ تو نہیں جانتا میں ماں ہوں ـــ" سارے تماشائی ہنستے ہیں ـــ
چرنجی کی بیوی دیکھتی ہے کہ کرشنا کماری بھی کسی بات پر ہنس رہی ہے ـــ چرنجی
کی بیوی کی ممتا جاگ اٹھتی ہے ۔ وہ چلانا شروع کر دیتی ہے :" مجھے اندر
جانے دو ... مجھے اندر جانے دو ـــ" کچھ گڑبڑ ہوتی ہے ۔ اتنے
میں چرنجی باہر نکلتا ہے اور اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے ۔ اور اس سے
کہتا ہے ـــ" کیا چاہتی ہو تم ـــ؟" چرنجی کی بیوی کہتی ہے :" میں اپنی لڑکی
سے ملنا چاہتی ہوں ـــ" چرنجی اس سے کہتا ہے ـــ" آؤ میں تمہیں اس سے
ملا دیتا ہوں ـــ" یہ کہہ کر وہ اسے ایک طرف لے جاتا ہے ۔ جہاں اس

کا ٹانگہ کھڑا ہے۔ اس میں چرنجی اسے بٹھا دیتا ہے اور ٹانگہ چلا تا ہے۔

ٹانگہ چلا جارہا ہے...... چرنجی کی بیوی شراب کے نشے میں بار بار چرنجی سے پوچھتی ہے — "مجھے میری بیٹی سے ملاؤ — مجھے میری بیٹی سے ملاؤ..... میں اس کی ماں ہوں میں اُسے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں" — چرنجی خاموش رہتا ہے۔ ٹانگے کی رفتار تیز ہوتی رہتی ہے — ایک بار وہ تنگ آکر چرنجی سے پوچھتی ہے — "کہاں لے جارہے ہو مجھے —" چرنجی جواب دیتا ہے: "جہاں پتی اور پتنی کو جانا چاہیئے" گھوڑا سرپٹ دوڑتا ایک کھائی میں گرتا ہے۔

ٹانگے کے پرزے اڑ جاتے ہیں۔ کھائی کے نیچے چرنجی اور اس کی بیوی پڑے ہیں۔ دونوں بُری طرح زخمی ہوئے ہیں — چرنجی مرچکا ہے۔ مگر اس کی بیوی ابھی زندہ ہے۔ وہ اپنی آنکھیں کھولتی ہے۔ اسے اپنی جوانی کا وہ دن یاد آتا ہے۔ جب وہ جھمکے پہننے لگ رہی تھی۔ وہ جوان ہے اور جھمکے اپنے کانوں میں دیکھ دیکھ کر خوش ہورہی ہے۔ اور گارہی ہے۔ اپنی بچی کو آواز دیتی ہے۔ اور کہتی ہے: "منّی..... منّی...... آ تجھے ایک چیز دکھاؤں" اس کی بند مٹھی کھلتی ہے — اس کی ہتھیلی پر وہی جھمکے نظر آتے ہیں۔ جو چرنجی اس کے لئے لایا تھا۔

شلجم

کھانا بھجوا دو میرا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔

"تین بج چکے ہیں — اس وقت آپ کو کھانا کہاں سے ملے گا؟"

"تین بج چکے ہیں، تو کیا ہوا — کھانا تو بہر حال ملنا ہی چاہیے۔ آخر میرا حصہ بھی تو اس گھر میں کس قدر ہے۔"

"کس قدر ہے؟"

"لو — اب تم حساب داں بن گئیں۔ جمع تفریق کے سوال کرنے لگیں مجھ سے۔"

"جمع تفریق کے سوال نہ کروں تو یہ گھر کب کا اُجڑ گیا ہوتا۔"

"کیا بات ہے آپ کی — لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے کھانا ملے گا۔ بھی یا نہیں؟"

"آپ ہر روز تین بجے آئیں تو کھانا خاک ملے گا ۔۔۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اگر آپ اس وقت کسی ہوٹل میں جائیں تو وہاں سے بھی آپکو دال روٹی نہیں مل سکے گی ۔۔۔ مجھے آپ کا یہ وطیرہ ہرگز پسند نہیں۔"

"کون سا وطیرہ؟"

یہی کہ آپ تین بجے تشریف لائے ہیں۔ کھانا پڑا جھک مارتا رہتا ہے۔ میں الگ انتظار کرتی رہتی ہوں مگر آنجناب خدا معلوم کہاں غائب رہتے ہیں۔"

"بھئی، دنیا میں انسان کو کئی کام ہوتے ہیں ۔۔۔ میں صرف دو دن ہی تو ذرا دیر سے آیا۔"

"ذرا دیر سے! ۔۔۔ ہر خاوند کو چاہیئے کہ وہ گھر میں بارہ بجے موجود ہوتا کہ اُسے ایک بجے تک کھانا مل جائے۔ اس کے علاوہ اُسے اپنی بیوی کا تابع فرمان ہونا چاہیئے۔

"اس لئے تو یہی بہتر ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں جا رہے، جہاں کے تمام نوکر اور بیرے اُس کے تابع فرمان ہوں۔"

"آپ کا ارادہ تو یہی ہے، جبھی تو آپ کئی دن سے پر تول رہے ہیں ۔۔۔ میں آپ سے کہتی ہوں ابھی چلے جائیے ۔۔۔"

"کھانا کھائے بغیر"

"جائیے، ہوٹل میں آپ کو مل جائے گا۔"

"لیکن تم نے تو ابھی کہا تھا۔ کہ اس وقت کسی ہوٹل میں بھی دال روٹی نہیں ملے گی ۔۔۔ بات کر کے بھول جاتی ہو۔"

"میرا دماغ خراب ہو چکا ہے، بلکہ کر دیا گیا ہے۔"

"یہ تو صحیح ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہے، لیکن یہ خرابی کس نے پیدا کی؟"

"خدا نہ کرے تم مرد، لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ میرے بغیر تمہارا گذر کیسے ہو گا۔"

"میں اپنی موٹر بیچ لوں گی۔"

"اس سے تمہیں کتنا روپیہ مل جائے گا؟"

"چھ سات ہزار تو مل ہی جائیں گے۔"

"ان چھ سات ہزار روپیوں میں تم کتنے عرصے تک اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکو گی؟"

"میں آپ کی طرح لکھ لٹ اور فضول خرچ نہیں ——— آپ دیکھئے گا کہ میں ان روپیوں میں ساری عمر گذار دوں گی ——— میرے بال بچے اسی طرح پلیں گے جس طرح کہ اب پل رہے ہیں۔"

"یہ ترکیب مجھے بھی بتا دو ——— مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی ایسا منتر ہاتھ آ گیا ہے جس سے تم نوٹ دگنے بنا سکتی ہو ——— ہر روز بٹوے سے نوٹ نکالے، ان پہ منتر پھونکا اور وہ دگنے ہو گئے۔"

"آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں ——— شرم آنی چاہیئے آپ کو۔"

"چلو ہٹاؤ اس قصے کو ——— کھانا دو مجھے۔"

"کھانا آپ کو نہیں ملے گا۔"

"بھئی آخر کیوں؟ ——— میرا قصور کیا ہے؟"

"آپ کے قصور اور آپ کی خطائیں اگر میں گنوانا شروع کر دوں تو میری ساری عمر بیت جائے۔"

"آپ نے اور کس نے، جو میری جان کا روگ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے نہ رات کا چین نصیب ہے، نہ دن کا"

دن کا تم چھوڑو ـــ رات کا چین آپ کو نصیب کیوں نہیں ـــ بڑے اطمینان سے سوتی رہتی ہیں ـــ جیسے محاورے کے مطابق گھوڑے بیچ کے سو رہا ہو"

"اپنے گھوڑے بیچ آدمی کیسے سو سکتا ہے ـــ کتنا واہیات محاورہ ہے"

واہیات ہی سہی، لیکن ابھی چند روز ہوئے تم نے ایک گھوڑا اور اُس کے ساتھ تانگہ بھی بیچ ڈالا تھا ـــ اور اس دن تم رات بھر خراٹے لیتی رہی تھیں۔

"مجھے ٹانگہ بیچنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ آپ نے مجھے موٹر لے دی تھی۔ اور خراٹے بھرنے کا الزام بالکل غلط ہے"

"محترمہ، جب آپ خواب خرگوش میں تھیں تو آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ خراٹے لیتی ہیں بخدا، اُس رات میں بالکل نہ سو سکا"

"اس کا اول، اس کا آخر جھوٹ"

"چلیئے تمہاری خاطر یہ بھی مان لیا ـــ اب کھانا دو"

"کھانا نہیں ملے گا آج ـــ آپ کسی ہوٹل میں جائیے ـــ اور میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ وہیں بسیرا کر لیجیے گا"

"تم کیا کرو گی؟ ـــ"

"میں ـــ میں مر تو نہیں جاؤں گی آپ کے بغیر"

"دیکھو بیگم، اب پانی سر سے گذر چکا ہے ـــ اگر تم نے کھانا نہ دیا تو میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا ـــ غضب خدا کا ـــ میرے پیٹ کا بھوک

کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے اور تم واہی تباہی بک رہی ہو ـــ مجھے کل اور آج ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے مجھے دیر ہو گئی، اور تم نے مجھ پر الزام دھر دیا کہ میں ہر روز دیر سے آتا ہوں ـــ کھانا دو مجھے ـــ ورنہ؟"

"آپ مجھے ایسی دھونس نہ دیں ـــ کھانا نہیں ملے گا آپ کو"

"یہ میرا گھر ہے ـــ میں جب چاہوں آؤں۔ جب چاہوں جاؤں۔ تم کون ہوتی ہو کہ مجھ پر ایسی سختیاں کرو ـــ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ تمہارا یہ مزاج تمہارے حق میں اچھا ثابت نہیں ہو گا۔"

آپ کا مزاج میرے حق میں تو بڑا اچھا ثابت ہوا ہے ـــ دن رات کڑھ کڑھ کے میرا یہ حال ہو گیا ہے۔"

"دس پاؤنڈ وزن اور بڑھ گیا ہے ـــ بس یہی حال ہوا ہے تمہارا۔ اور میں تمہاری زود رنج اور چڑچڑی طبیعت کے باعث بیمار ہو گیا ہوں۔"

"کیا بیماری ہے آپ کو"

"تم نے کبھی پوچھا ہے کہ میں اس قدر تھکا تھکا سا کیوں رہتا ہوں۔ کبھی تم نے غور کیا کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت میرا سانس کیوں پھول جاتا ہے۔ کبھی تم کو اتنی توفیق ہوئی کہ میرا سر ہی دبا دیں جو اکثر درد کے باعث پھٹنے کے قریب ہوتا ہے ـــ تم عجب قسم کی رفیقۂ حیات ہو ـــ اگر معلوم ہوتا کہ آپ ایسا خاوند میرے پلّے باندھ دیا جائے گا۔ تو میں نے دہیں اپنے گھر میں زہر پھانک لیا ہوتا۔"

"زہر تم اب پھانک سکتی ہو ـــ کہو تو میں ابھی لا دوں ـــ

"لے آئیے"

"لیکن پہلے مجھے کھانا کھلوا دو۔"

"میں کہہ چکی ہوں وہ نہیں ملے گا آپ کو آج؟"

کل سے تو خیر مل ہی جایا کرے گا، اس لئے کہ تم یہاں سے عدم آباد پہنچ چکی ہوگی ــــ بہر حال میں بھوکے پیٹ کے ساتھ تمہارے لئے زہر لینے باہر نہیں جا سکتا ــــ بہت ممکن ہے موٹر چلاتے چلاتے ہی مجھے غش آ جائے اور میں غفر اللہ ہو جاؤں ــــ اس لئے میں خود ہی کوشش کرتا ہوں۔"

"آپ کیا کوشش کیجیے گا؟"

"خانساماں کو بلاتا ہوں"

"آپ اسے نہیں بلا سکتے۔"

"کیوں؟"

"بس، میں نے کہہ جو دیا کہ آپ کو ان معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ــــ"

"حد ہو گئی ہے کہ میں اپنے گھر میں اپنے خانساماں کو بھی نہیں بلا سکتا۔ ــــ نوکر کہاں ہے؟"

"جہنم میں!"

"اس وقت میں بھی اسی جگہ ہوں، لیکن میں اس کو دیکھ نہیں پاتا ــــ ادھر ہٹو، ذرا میں اس کو تلاش کر دوں ــــ شاید مل جائے۔"

"اس سے کیا کہنا ہے آپ کو۔"

"کچھ نہیں ــــ صرف اتنا کہوں گا کہ تم علیٰحدہ ہو جاؤ۔ تمہارے بدلے میں اس گھر کی نوکری خود کیا کروں گا"

"آپ کر چکے!"

"سلام حضور ــــ بیگم صاحب سالن تیار ہے ــــ صاحب کھانا لگا دوں ٹیبل پر؟"

"تم دفع ہو جاؤ یہاں سے"

"لیکن بیگم صاحب آپ نے صبح جب خود باورچی خانے میں شلجم پکائے تو وہ سب کے سب جل گئے کہ آنچ تیز تھی ــــ اس کے بعد آپ نے آرڈر دیا کہ صاحب دیر سے آئیں گے۔ اس لئے تم جلدی جلدی کوفتی اور سالن تیار کر لو ــــ سو میں آپ کے حکم کے مطابق دو گھنٹوں کے اندر اندر دو سالن تیار کر لئے ہیں۔ اب آپ فرمائیے تو میں ٹیبل لگا دوں ــــ دونوں انگیٹھیوں پہ دھرے ہیں ــــ ایسا نہ ہو آپ کے شلجموں کی طرح جل کر کوئلہ ہو جائیں ــــ میں جاتا ہوں ــــ آپ جب بھی آرڈر دیں گی اینارہ ٹیبل لگا دے گا۔"

"تو یہ بات تھی"

کیا بات تھی ــــ میں اتنی دیر تک باورچی خانے کی گرمی میں جھلستی رہی۔ اس کا آپ کو کچھ خیال ہی نہیں ــــ آپ کو شلجم پسند ہیں، تو میں نے سوچا، خود اپنے ہاتھ سے پکاؤں ــــ کتاب ہاتھ میں تھی۔ جس میں ساری ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے میں سو گئی ــــ

اور وہ کم بخت شلجم جل بھی کر کوئلہ بن گئے — اب اس میں میرا کیا قصور ہے"

کوئی قصور نہیں"

چلیے — میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

"یہاں تو بڑے بڑے گھمبے دوڑ رہے ہیں"۔

"ہر بات میں مذاق؟"

مذاق برطرف — ذرا ادھر آؤ — میں تمہارے شلجم دیکھنا چاہتا ہوں — کہیں وہ بھی کوئلہ نہیں بن گئے؟"

کھانا کھانے کے بعد دیکھا جائے گا۔

سعادت حسن منٹو

۲۶ ستمبر ۱۹۵۴ء

برف کا پانی

"یہ آپ کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں۔"

"میری عقل پہ تو اسی وقت پتھر پڑ گئے تھے۔ جب میں نے تم سے شادی کی۔ بھلا اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اپنی ساری آزادی سلب کرائی۔"

"جی ہاں آزادی تو آپ کی یقیناً سلب ہوئی اس لئے کہ اگر آپ اب کھلے بندوں عیاشی نہیں کر سکتے۔ شادی سے پہلے آپ کو کون پوچھنے والا تھا۔ جدھر منہ اٹھایا چل دیئے۔ جھک مارتے رہے۔"

"دیکھو! میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کچھ کہنا ہو، چند لفظوں میں صاف صاف کہہ دیا کرو۔ تم مجھے یہ جھک جھک پسند نہیں۔ جس طرح میں صاف گو ہوں، اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی ہوں۔"

"آپ کی صاف گوئی تو ضرب المثل بن چکی ہے۔"

"تمہاری یہ طنز خدا معلوم تم سے کب جدا ہو گی۔ اتنی بھونڈی چیز ہے

کہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

"آپ کی طبیعت تو شگفتہ گفتگو سن کر بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے۔ اصل میں آپ کو میری کوئی چیز بھی پسند نہیں۔ ہر وقت مجھ میں کیڑے ڈالنا آپ کا شغل ہو گیا ہے۔ اگر میں آپ کے دل سے اتر گئی ہوں تو صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے۔ بڑے صاف گو بنے پھرتے ہیں۔ آپ ایسا ریاکار آدمی شاید ہی اس دنیا کے تختے پر ہو۔"

"اب میں ریاکار بھی ہو گیا۔ کیا ریاکاری کی ہے میں نے تم سے یہی کہ تمہاری نوکروں کی طرح خدمت کرتا ہوں۔"

"بڑی خدمت کی ہے آپ نے میری۔"

"تم سر پہ قرآن اٹھاؤ اور بتاؤ کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے کبھی تم نے میرا سر تک سہلایا ہے۔ میں بخار میں کھنکتا رہا ہوں، کبھی تم نے میری تیمارداری کی۔ پچھلے دنوں میرے سر میں شدت کا درد تھا۔ میں نے رات کو تمہیں آواز دی اور کہا کہ اٹھو، مجھے بام لا دو۔ مگر تم نے کروٹ بدل کر کہا میری نیند خراب نہ کیجئے۔ آپ اٹھ کر ڈھونڈھ لیجئے کہاں ہے۔ اور یاد ہے جب تمہیں نمونیا ہو گیا تھا۔ تو میں نے سات راتیں جاگ کر کاٹی تھیں دن اور رات مجھے پل بھر کا چین نصیب نہیں تھا۔"

"دن بھر سوئے رہتے تھے آپ۔ میری بیماری کا ایک بہانہ مل گیا تھا سات چھٹیاں لیں اور دفتر کے کام سے نجات پا کر آرام کرتے رہے۔ میں آپ کے سارے حیلے بہانے جانتی ہوں۔ میرا علاج آپ نے کیا تھا یا ڈاکٹروں نے؟

ان ڈاکٹروں کو تم بلا کر لائی تھیں کیا ۔۔۔ اور دوائیں بھی کیا تم نے خود جا کر خریدی تھیں ۔۔۔ اور جو روپیہ خرچ ہوا وہ کیا فرشتوں نے اوپر سے پھینک دیا تھا؟ ۔۔۔ کتنے سفید جھوٹ بولتی ہو۔ کہیں دن کو سویا رہتا تھا۔ قسم خدا کی جو ایک لمحے کے لئے بھی ان دنوں سویا ہوں تم بیمار ہو جاؤ تو گھر کی اینٹیں بھی جاگتی رہتی ہیں ۔۔۔ تم اس وقت کس کو سونے دیتی ہو۔ آہ دبکار کا تانتا بندھا رہتا ہے، جیسے کسی پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔"

"جناب، بیماریاں ظلم نہیں ہوتیں تو کیا ہوتی ہیں۔ جو میں نے برداشت کیا ہے، وہ آپ کبھی نہ کر سکتے، اور نہ کبھی کر سکتے ہیں ۔۔۔ میں نے کتنی بیماریاں خندہ پیشانی سے سہی ہیں؟ ۔۔۔ آپ کو تو خیر اس وقت کچھ یاد نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ آپ میرے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔"

"دن ہی کو میں تمہارا دشمن بن جاتا ہوں ۔۔۔ رات کو تو مجھے تم نے ہمیشہ بہترین دوست سمجھا۔"

"شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے۔ رات اور دن میں فرق ہی کیا ہے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" کہہ کر آپ نے میرا گلا گھونٹ دیا، کہ میں آپ سے کچھ اور کہہ نہ سکوں۔"

"لو بھئی اب میں اطمینان سے یہاں بیٹھ جاتا ہوں ۔۔۔ آرام جائے جہنم میں ۔۔۔ تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔ ایک ہی سانس میں کہتی چلی جاؤ۔"

"میری سانس اتنی لمبی نہیں۔"

"عورتوں کی سانس کے متعلق تو ہمیشہ یہی سُنا تھا کہ بہت لمبی ہوتی ہے اور زبان بھی ماشاءاللہ کافی دراز ہ۔"

"آپ یہ مہین مہین چٹکیاں نہ لیجیے ــــ میں نے اگر کچھ کہدیا تو آپ کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔"

"اس تن بدن میں کئی بار آگ لگ چکی ہے مگر میرے اندر فائر بریگیڈ یعنی آگ بجھانے والا انجن موجود ہے۔ جو ایسے آڑے وقتوں میں میرے کام آتا ہے ــــ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ــــ آج تم بھری بندوق بنی کیوں بیٹھی ہو ــــ کیا ارادہ ہے تمہارا! ــــ چلو ایک فائر کرو اور میرا قصّہ تمام کرو۔"

"قصّہ تو میرا آپ تمام کر کے رہیں گے۔"

"کس لئے ــــ مجھے تم سے کیا بُغض ہے۔ اللہ کے واسطے کا بیر تو تمہیں مجھ سے ہے۔"

"محبت اور اطاعت کو آپ بیر سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا تھا۔ کہ آپ کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔"

"میری عقل پر پتھر پڑیں یا کوہِ ہمالیہ کا پہاڑ، لیکن تمہاری محبت اور اطاعت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اطاعت کو فی الحال چھوڑو۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب تک تم محبت بھری گفتگو کر رہی تھیں۔"

"تو میں نے آپ کو کونسی گالی دی ہے؟"

"گالی دینے میں تم نے کوئی کسر تو اُٹھا نہیں رکھی ــــ ریا کار تک تو بنا دیا مجھ کو ــــ اس سے بدتر گالی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"یہ لو۔ کھلا گریبان ہے۔۔۔ میں نے اپنا سارا سر اس میں ڈال دیا۔ اب تم بتاؤ کہ میں دیکھوں؟۔۔۔ مجھے تو صرف ایک شکل نظر آتی ہے، اور وہ تمہاری ہے۔ بڑی خوفناک۔ بڑی ہیبت ناک۔"

"تو کوئی دوسری کر لیجیے، جو بڑی خوش شکل ہو۔"

"ایک ہی کر کے میں نے بھر پایا ہے۔ خدا نہ کرے، میری زندگی میں کوئی دوسری آئے۔"

"آپ مجھ سے اس قدر تنگ کیوں آ گئے ہیں؟"

"میں تو قطعاً تنگ نہیں آیا۔ اس لیے کہ جب سے میری عقل پہ پتھر پڑے ہیں میں نے سوچنا ہی بند کر دیا ہے۔ اس سے کیا حاصل ہو گا۔ جبکہ تم ہر روز کوئی نہ کوئی فضیحتا کھڑا کر دیتی ہو۔۔۔ میں پوچھتا ہوں۔ اس سے تمہیں کیا مزا ملتا ہے۔ سوائے اس کے کہ میرا دل جلاؤ۔"

"میرا دل تو جل کر کوئلہ ہو چکا ہے۔ سچ پوچھئے تو میں چاہتی ہوں کچھ کھا کے مر جاؤں۔ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں نے ایک من برف منگوائی ہے۔ اُسے چار بالٹیوں میں پانی کے اندر ڈال رکھا ہے۔ اس ٹھنڈے پانی سے نہاؤں گی۔ اور پنکھے کے نیچے بیٹھ جاؤں گی۔ ایک مرتبہ پہلے مجھے نمونیا تو ہو ہی چکا ہے۔ اب ہو گا تو پھیپھڑے یقیناً جواب دے جائیں گے۔ اچھا خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔۔۔ خودکشی کا یہ طریقہ تم نے بہت اچھا ڈھونڈا ہے،

جو آج تک کسی کو سوجھا نہیں ہو گا۔"

"آپ کے پہلو میں تو دل ہی نہیں۔"

"جو کچھ بھی ہے، بہرحال موجود ہے اور دھڑکتا بھی ہے — جاؤ یخ آلود پانی سے نہا کر پنکھے کے نیچے بیٹھ جاؤ۔"

"جانور ہی ہوں — لیکن آپ سے چند باتیں کرنی تھیں۔"

"ضرور کرو۔"

"میرے بچوں کا آپ ضرور خیال رکھئے گا۔"

"اس کے کہنے کی ضرورت کیا ہے — وہ میرے بچے نہیں کیا؟"

"ہیں — لیکن شاید آپ اُن سے اچھا سلوک میری وجہ سے کریں۔"

"نہیں نہیں، تم ایسی کوئی فکر نہ کرو۔ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے گی — میں اُن کو بورڈنگ ہاؤس میں تمہارے مرنے کے بعد فوراً داخل کرا دوں گا۔ لیکن بعد کی بات فضول ہے، میں ابھی اُنہیں لے جاتا ہوں بورڈنگ ہاؤس کا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے — تم جاؤ، اپنا کام کرو — میں اُنہیں لے جاتا ہوں۔"

"اچھا! خدا حافظ!"

"خدا تمہارا حافظ ہو۔ مجھے تو فی الحال خودکشی نہیں کرنا ہے — لیکن سنو، اگر تمہیں نمونیا ہو جائے تو میں کس ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"ہرگز نہیں، میں مرنا چاہتی ہوں۔"

"تو میں نہیں بلاؤں گا۔ لیکن نمونیے کے مریض فوراً تو نہیں مرتے — پانچ

چھ روز تو لگاتے ہیں

"آپ اس عرصہ تک انتظار کیجئے گا۔"

"بہت بہتر۔"

"میری کبھی کُسنی معاف کر دیجئے گا۔"

"وہ تو میں نے اسی روز کر دی تھی۔ جب تم سے نکاح ہوا تھا۔"

"میں آپ سے جاتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ کہ آپ کی عقل پر جو پتھر پڑ گئے ہیں۔ اُنہیں دُور کر دیجئے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ اگر تم کہو تو قسم اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔۔۔ اچھا تو میں چلا۔۔۔ بچے باہر کھیل رہے ہیں۔ انہیں ہوٹل لے جاتا ہوں واپس دو تین گھنٹے میں آجاؤں گا۔ اگر اس دوران میں تم مر گئیں۔ تو بہت اچھا تجہیز و تکفین کا سامان کر دوں گا۔۔۔ مجھے ابھی کل ہی تنخواہ ملی ہے۔"

"جائیے۔ میں بھی چلی۔"

"الوداع"

"الوداع"

"کبھی کبھی مجھ نابکار کو یاد کر لیا کیجئے۔"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ تم نابکار کیوں کہتی ہو خود کو۔"

"میں کس کام کی ہوں۔"

"خیر چھوڑو۔ بحث اس پر الگ شروع ہو جائے گی۔ اور تمہاری خریدی ہوئی ایک من برف پگھل کر گرم پانی میں تبدیل ہو جائے گی۔

"یہ تو آپ نے درست کہا — اچھا — میں چلی۔"

٭ ٭ ٭

"میں آگیا ہوں! بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا کے — تم غسل خانے میں ابھی تک کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔"

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

"میں نے وہ خط دوبارہ پڑھا۔"

"کون سا خط؟"

"جو آپ کے میز کی دراز میں پڑا تھا۔ کسی لڑکی کی طرف سے تھا۔ اب میں نے جو غور سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ وہ آپ کے نام نہیں۔ بلکہ اس اخبار کے ایڈیٹر کے نام ہے۔ جہاں آپ کام کرتے ہیں۔ خطوں کا جواب تو آپ ہی دیا کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں نے آپ پر خواہ مخواہ شک کیا۔"

"تم ہمیشہ خواہ مخواہ شک کیا کرتی ہو؟ — اب تو میری عقل کے پتھر ہٹ گئے — وہ لڑکی نہیں، کوئی مرد ہے، اسی لئے میں تفتیش کی غرض سے اُسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خیر چھوڑو اس قصے کو ٹھنڈا پانی تو پلواؤ ایک من برف تم نے منگوائی تھی۔"

"اس کا سب پانی میں نے غسل خانے میں ڈال دیا۔ بڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے آپ بھی یہاں آجائیے۔"

چند مکالمے

"السلام علیکم!"

وعلیکم السلام"

"کہئے مولانا کیا حال ہے؟"

"اللہ کا فضل وکرم ہے۔ بہر حال میں گزر رہی ہے"

"حج سے کب واپس تشریف لائے؟"

"جی آپ کی دعا سے ایک ہفتہ ہو گیا ہے"

"اللہ اللہ ہے۔ آپ نے ہمت کی تو خانہ کعبہ کی زیارت کر لی۔ ہماری تمنا دل ہی میں رہ جائے گی۔ دعا کیجئے کہ یہ سعادت ہمیں بھی نصیب ہو۔

"انشاء اللہ۔ ورنہ میں گنہگار کس قابل ہوں"

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ــــــ ہاں دیکھئے ذرا کان کیجئے۔ ادھر

میرے ہاں کھانڈ کی دو بوریاں ہیں۔ آپ کی بے شمار لوگوں سے جان پہچان ہے کسی کو ضرورت ہو تو مجھ سے فرما دیجیے گا۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے۔ دام واجبی ہونگے۔"

"لیجیے جناب ہماری خدمات کا صلہ مل گیا۔"

"کیا! ویسے مبارک ہو۔"

"سو سو مبارک۔ کمپنی نے نوکری سے جواب دے دیا۔"

"ہائیں! یہ کب کی بات ہے؟"

"ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"

"لاحول ولا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔"

"دو سو ملازموں کی چھانٹی ہوئی تھی نا۔"

"بہت افسوس کی بات ہے۔ کوئی احتجاج وغیرہ ہوا تھا؟"

"سیکڑوں ہڑتالیں ہوئیں۔ جلوس نکلے کئی مرتبہ لوگوں نے بھوک ہڑتال کی وعدے ہوئے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"تعجب ہے۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔"

"اللہ رحم کرے۔"

"اللہ اب رحم نہیں کرے گا۔ وہ دن لد گئے۔ جب وہ ہر مل بہ کرم ہوا کرتا تھا۔ اتنے آدمی ہیں، وہ کس کس کی حاجت روا کرے۔ میرا تو خیال ہے، اوپر آسمانوں پر بھی، راشننگ سسٹم شروع ہو گیا ہے۔

"میں اس بدذات سے کیا کہوں۔ صاف مجھے دغا دے گیا۔"

"کیسے؟"

"حرام زادے نے وعدہ مجھ سے کیا اور دو نوں" بیوک" گاڑیاں کہیں ٹھکانے لگا دیں۔"

"اس کی وجہ؟"

"میں نے اس کا ایک کام کیا تھا ــــ اس کے عوض میں اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے ایک بیوک کار جو اس کے پاس آنے والی تھی آدھی قیمت پر دے دیگا۔"

"اور جو تم نے اس کا کام کیا تھا ـ وہ تو لاکھوں کا تھا!"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ بلڈی سوائن نے میرے ساتھ دھوکا کیا لیکن میں بھی اس سے بدلہ لوں گا میں اس سے کم بدذات ــــ میرا مطلب ہے کہ کم چالباز نہیں ـ اس کو ایسا ارٹنگا دوں گا کہ سیدھی ناک "بیوک" میرے گھر پر پہنچ کے جائے گا۔"

باورچی کو بلاؤ ـ جلدی بلاؤ ـ ہم اس سے بات کرنا مانگتا ہے!

"حضور حاضر ہوں۔"

"یہ تم نے آج کیسے واہیات کھانے پکائے ہیں؟"

"حضور!"

"حضور کے نیچے ــــ اس پلیٹ سے بیگم صاحب نے ایک ہی نوالہ اٹھایا تھا کہ انہیں متلی آگئی ـ"

"حضور! ممکن ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو — میں معافی چاہتا ہوں"

"معافی کے بچے — اٹھاؤ یہ سالن اور باہر پھینک کر آؤ۔"

"ہم نوکر کھالیں گے سرکار۔"

"نہیں — باہر ڈسٹ بن میں ڈال دو۔ — اور تم سزا کے طور پر بھوکے رہو — اٹھئے بیگم! ہم کسی ہوٹل میں چلتے ہیں"

"اماں — اب گزارہ کیسے ہوگا۔ یہاں لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آگیا ہے!"

"تو ٹھیک کہتی ہے بیٹا"

"سارا بازار ہی مندا ہے۔"

"کیوں؟"

"لوگوں کے پاس روپیہ نہیں"

"لیکن یہ جو سڑکوں پر اتنی شان دار موٹریں چلتی ہیں۔ یہ جو عورتوں کے تن پر زرق برق لباس ہوتے ہیں! یہ کہاں سے آتے ہیں۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے اماں؟"

"ان لوگوں کے پاس ہے"

"تو پھر بازار کیوں مندا ہے؟"

"اب ان لوگوں نے اپنے آپس ہی میں ہمارا دھندا شروع کر دیا ہے۔"

"ڈارلنگ!"

"جی"

"ساری دکانیں چھان ماریں — مگر تمہارے سائز کی "میدان فورم" بریزیئر نہ مل سکی۔"

"اوہ! ہاؤ سیڈ — میرا سائز ہی کیا واہیات سا ہے۔"

"دعوت تو خیاب ایسی ہوگی کہ یہاں کی تاریخ میں یادگار رہے گی لیکن ایک افسوس ہے کہ فرانس سے جو میں نے شمپین منگوائی تھی۔ وقت پر نہ پہنچ سکے گی۔"

"اجی سنیئے تو!"

"اوہ آپ! — مجھے بڑا ضروری کام ہے — معاف فرمائیے!"

"معافیاں تم لاکھ مرتبہ مانگ چکے ہو — وہ میرا سو روپے کا قرض ادا کرو، جو تم نے آج سے قریب ایک سال ہوا لیا تھا۔"

"میں پھر معافی چاہتا ہوں — میری بیوی بیمار ہے۔ دوا لینے جا رہا ہوں۔"

"میں ان گھسوں میں آنے والا نہیں۔ خدا کی قسم! اگر آج میرا قرض ادا نہ ہوا۔ تو سر پھوڑ دوں گا تمہارا۔"

"آپ کیوں اتنی زحمت اٹھائیں — میں خود ہی اس دیوار کے ساتھ ٹکر مار کے اپنا سر پھوڑے لیتا ہوں — یہ لیجئے!"

"یہ چرس کی لت تمہیں کہاں سے پڑی؟"

"کیا بتاؤں یار — اب تو اس کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔"

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ یہ لت کہاں سے پڑی۔ تم نے کچھ اور ہی ہانکنا شروع کر دیا۔"

"بھائی، یہ لت مجھے جیل میں لگی۔"

"جیل میں — وہاں تو ایک مکھی بھی اندر نہیں جا سکتی۔"

"بھائی میرے وہاں گمر مچھ بھی جا سکتے ہیں۔ ہاتھی بھی جا سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پاس دولت ہے۔ تو وہاں آپ ایک دو ہاتھی بھی ساتھ رکھ سکتے ہیں۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بتاؤ یہ چرس وہاں کیسے پہنچ جاتی ہے؟"

"ویسے ہی جیسے ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ میرے عزیز جیل خانہ صرف ان لوگوں کے لئے جیل خانہ ہے۔ جو صاحب استطاعت نہیں — جو دولتمند مجرم ہیں۔ ان کو وہاں ہر قسم کی مراعات مل سکتی ہیں اور ملتی ہیں۔"

"اگر تم چاہو تو وہاں تمہیں شراب مل سکتی ہے۔ گانجہ مل سکتا ہے۔ افیم دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگر تم بڑے رئیس ہو۔ تو اپنی بیوی کو بھی وہاں بلا سکتے ہو جو رات بھر تمہاری مٹھی چاپی کرتی رہے گی۔"

جیل خانوں میں ایک 'خاکی' مارکیٹ ہوتی ہے۔ جو بلیک مارکیٹ سے زیادہ ایماندار ہے۔"

کرنل صاحب آپ کی عمر کتنی ہو گی؟"

"میرا خیال ہے ۔ پینسٹھ کے قریب ہو گی — آپ کی؟"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں ۔ ماشاء اللہ ابھی جوان ہیں — میری عمر — میری عمر بھی پچیس چھبیس برس کے قریب ہو گی"

"تو ہم دونوں سچ بول رہے ہیں"

مجھے لپ اسٹک سے نفرت ہے ۔ معلوم نہیں عورتیں اسے کیوں استعمال کرتی ہیں ۔ اس سے ہونٹوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے"

"مجھے خود اس سے نفرت ہے"

"لیکن تمہارے ہونٹوں پر تو یہ واہیات چیز موجود ہے ۔ خون کی طرح سرخ ہو رہے ہیں"

"یہ سرخی میرے اپنے ہونٹوں کی ہے ، یعنی مصنوعی نہیں"

"تو آؤ ایک بوسہ لے لوں"

"بڑے شوق سے"

"بڑے بیٹھے اب — مجھے معلوم نہیں تھا ۔ کہ مرد بھی لپ اسٹک استعمال کرتے ہیں"

"وہ کیسے؟"

"ذرا آئینے میں اپنے ہونٹ ملاحظہ فرمائیے"

"صاحب ، آپ سے کوئی ملنے آیا ہے"

"کہہ دو، صاحب گھر میں نہیں ہیں۔"

"بہت اچھا جناب۔"

"چلا گیا؟"

"جی نہیں چلی گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"جی وہ ایک ایکٹرس تھی۔ جس کا نام........"

"بھاگو۔ بھاگو — جلدی اُس کو بلا کے لاؤ اور کہو، تم نے جھوٹ بولا تھا کہ صاحب گھر میں نہیں ہیں۔"

"آپ آج کل کہاں گھنٹوں غائب رہتے ہیں؟"

"بیگم ایک یتیم بچہ ہے، اس کو دیکھنے کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔"

"اس یتیم بچے سے آپ کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"یتیم بچہ ہے نا۔"

"آپ کی جیب میں اس کا فوٹو بھی موجود رہتا ہے۔"

"اس لئے — اس لئے —"

"کہ وہ آپ کا یتیم بچہ ہے۔"

"نون سنس۔"

"آپ کی قمیص پر سرخ دھبا کیسے لگا؟"

"میری قمیص پر؟ — کہاں سے؟"

"داہنے ہاتھ، گریبان کے قریب۔"

"اوہ — میں جب دفتر میں کسی ضروری مسئلے پر غور کر رہا ہوتا ہوں، تو مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ یہ لال پنسل کا نشان ہے جس سے میں نے کھجلا لیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ لیکن اس میں سے خوشبو تو میکس فیکٹر کی آ رہی ہے۔"

"تم آج کل کس کی بیوی ہو؟"

"کل تو مسٹر — کی تھی۔ آج چھٹی پر ہوں۔"

"آپ میدان جنگ میں جا رہے ہیں۔ خدا آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ لیکن مجھے کوئی نشان دیتے جائیے۔"

"میری نشانی تو خود تم ہو۔"

"نہیں کوئی ایسی چیز دیتے جائیے جس کو دیکھ دیکھ کر میں اپنا دل بہلاتی رہوں۔"

"میں وہاں سے بھیج دوں گا۔"

"کیا چیز؟"

"وہ زخم جو مجھے لڑنے کے دوران میں آئیں گے۔"

"آپ کی بیگم کیسی ہیں ؟"

"یہ تو آپ کو معلوم ہو گا۔ اپنی بیگم کے بارے میں مجھ سے آپ دریافت فرما سکتے ہیں "

"وہ کیسی ہیں ؟"

"پہلے سے بدرجہا بہتر اور خوش ہیں ۔۔۔ مجھے ان کی طبیعت بہت پسند آئی ہے "

"یار تم اتنی عورتوں سے یارانہ کیسے گانٹھ لیتے ہو ؟"

"یارانہ کہاں گانٹھتا ہوں ۔ باقاعدہ شادی کرتا ہوں "

"شادی کرتے ہو ؟"

"ہاں ! بھائی میں حرام کاری کا قائل نہیں ۔ شادی کرتا ہوں ۔ اور جب اس سے جی اُکتا جاتا ہے ۔ تو حق مہر ادا کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہوں !"

"اسلام زندہ باد !"

"رتی، ماشہ، تولہ"

زینت اپنے کالج کی زینت تھی، بڑی زیرک، بڑی ذہین، اور بڑے اچھے خدوخال کی صحت مند نوجوان لڑکی جس طبیعت کی وہ مالک تھی، اس کے پیش نظر اس کی ہم جماعت لڑکیوں کو یہ کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ کہ وہ اتنی مقدار پسند عورت بن جائے گی۔

ویسے وہ جانتی تھیں کہ چائے کی پیالی میں صرف ایک چمچ شکر ڈالتی ہے۔ زیادہ ڈال دی جائے۔ تو پینے سے انکار کر دیتی ہے۔ قمیض اگر آدھا انچ بڑی یا چھوٹی سِل جائے، تو کبھی نہیں پہنے گی۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند سے بھی نپی تلی محبت کرے گی۔

زینت سے ایک لڑکے کو محبت ہو گئی۔ وہ اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کا اور زینت کا مکان آمنے سامنے تھا۔ ایک دن اس لڑکے نے جس کا نام جمال تھا اسے کوٹھے پر اپنے بال خشک کرتے دیکھا تو وہ

سر تاپا محبت کے شربت میں شرابور ہو گیا۔

زینت وقت کی پابند تھی۔ صبح ٹھیک چھ بجے اُٹھتی۔ اپنی بہن کے دو بچوں کو سکول کے لئے تیار کرتی۔ اس کے بعد خود نہاتی اور سر پہ تولیہ لپیٹ کر اوپر کوٹھے پر چلی جاتی اور اپنے بال جو اس کے ٹخنوں تک آتے تھے سکھاتی کنگھی کرتی اور نیچے چلی آتی۔ جُوڑا وہ اپنے کمرے میں کرتی تھی۔

اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر عمل کے وقت معین تھے۔ جمال اگر صبح ساڑھے چھ بجے اُٹھتا اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کر اپنے کوٹھے پر پہنچتا تو اُسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لئے کہ زینت اپنے بال سکھا کر نیچے چلی گئی ہوتی تھی۔ ایسے لمحات میں وہ اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کے واپس نیچے چلا جاتا۔ اس کو سیڑھیاں اُترتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ ہر زینہ کنگھی کا ایک دندانہ ہے۔ جو اُترتے ہوئے ایک ایک کرکے ٹوٹ رہا ہے۔

ایک دن جمال نے زینت کو ایک رقعہ بھیجا۔ وقت پر وہ کوٹھے پر پہنچ گیا تھا جبکہ زینت اپنے ٹخنوں تک لمبے بال سکھا رہی تھی۔ اس نے یہ تحریر خوشبودار کاغذ پر تھی۔ روڑے میں لپیٹ کر سامنے کوٹھے پر پھینک دی۔ زینت نے یہ کاغذی پیرہن میں ملبوس پتھر اٹھایا۔ کاغذ اپنے پاس رکھ لیا اور پتھر واپس پھینک دیا۔ لیکن اس کو جمال کی شوخیٔ تحریر پسند نہ آئی۔ جو سر تا پا زیادتی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

زلف برہم سنبھال کر چلیے   راستہ دیکھ بھال کر چلیے

موسمِ گل ہے اپنی باہنوں کو میری باہنوں میں ڈال کر چلیے

موسمِ گل قطعاً نہیں تھا۔ اس لئے اس آخری شعر نے اس کو بہت کوفت پہنچائی۔ اس کے گھر میں کئی گملے تھے جن میں بوٹے لگے تھے۔ یہ سب کے سب مرجھائے ہوئے تھے۔ جب اس نے یہ شعر پڑھا تو اس کا ردِ عمل یہ ہوا۔ کہ اس نے یہ مرجھائے ہوئے بے گل بوٹے اکھاڑے، اور انہیں اس کنستر میں ڈال دیا۔ جس میں کوڑا کرکٹ وغیرہ جمع کیا جاتا تھا۔

ایک زلف اس کی بہم رہتی تھی۔ لیکن راستہ دیکھ بھال کر چلنے کا سوال کیا پیدا ہوتا تھا۔ زینت نے سوچا کہ یہ محض شاعرانہ تک بندی ہے۔ لیکن اس کے بال ٹخنوں تک لمبے تھے۔ اسی دن جب اس کو یہ رقعہ ملا۔ تو نیچے سیڑھیاں اُترتے ہوئے جب اسے ایک زینے پر اپنی ایک بھانجی کے کان سے گری ہوئی سونے کی بالی اٹھانا پڑی تو وہ اس کی سینڈل سے اُلجھ گئے اور گرتے گرتے بچی۔ چنانچہ اس دن سے اس نے راستہ دیکھ بھال کر چلنا شروع کیا۔ مگر اس کو باہنوں میں باہنیں ڈال کر چلنے میں سخت اعتراض تھا۔ وہ اسے نیا دتی سمجھتی تھی۔ اس لئے کہ موسمِ گل نہیں تھا۔ موسمِ گل بھی ہوتا تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ کہ پھولوں سے باہنوں کا کیا تعلق ہے۔ اس کے نزدیک باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا بڑا عامیانہ بلکہ سوقیانہ فعل تھا۔ چنانچہ جب وہ دوسرے روز صبح چھ بجے اُٹھی اور اپنی بھانجیوں کو سکول جانے کے لئے تیار کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ اتوار ہے اس کے دل و دماغ پر وہ دو شعر سوار تھے۔

اس نے سوتے وقت تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بچیوں کو تیار کرے گی۔ اس کے بعد

نہائے گی اور اپنے کمرے میں جا کر جمال کا رقعہ پڑھ پڑھ کر اسے جی ہی جی میں کوسے گی مگر اتوار ہونے کے باعث اس کا یہ تہیہ درہم برہم ہو گیا۔ اسے وقت سے پہلے غسل کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ اپنے روزمرّہ کے اوقات کے معاملے میں بڑی پابند تھی۔

اس نے غسل خانے میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا۔ دو بالٹیوں سے پہلے نہاتی تھی۔ دو بالٹیوں سے اب بھی نہائی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے نہاتے وقت اپنی بانہوں کو دیکھا جو سڈول اور خوبصورت تھیں۔ پھر اسے جمال کی بانہوں کا خیال آیا۔ لیکن اس نے ان کو دیکھا ہی نہیں تھا قمیص کی آستینوں کے اندر چھپی رہتی تھیں۔ ان کے متعلق وہ کیا رائے قائم کر سکتی تھی۔ بہرحال وہ اپنے گدرائے ہوئے بازو دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ اور جمال کو بھول گئی۔

غسل میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ اپنے حسن و جمال کے متعلق اندازہ کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کافی دیر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زیادہ حسین تو نہیں لیکن قبول صورت اور جوان ضرور ہے۔

جوان وہ بلاشبہ تھی۔ وہ چھوٹی مختصر سی ریشمی چیز جو اس نے اپنے بدن سے اتار کر لکس صابن کی ہوائیوں میں دھوئی تھی۔ اس کے سامنے ٹنگی تھی۔ یہ گیلی ہونے کے باوجود بہت سی چٹکیاں کھا رہی تھی۔

اس کے بعد روڑے میں لپٹا ہوا ایک اور خط آیا۔ اس میں بے شمار اشعار تھے۔ شعروں سے اسے نفرت تھی۔ اس لئے کہ وہ انہیں محبت کا نمایانہ ذریعہ اظہار سمجھتی تھی۔

خط آتے رہے زینت وصول کرتی رہی۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا

وہ محبت کے شدید جذبے کی قائل نہیں تھی۔ اس کو جمال پسند تھا۔ اس لئے کہ وہ خوش شکل اور صحت مند جوان تھا۔ اس کے متعلق وہ لوگوں سے یہ بھی سن چکی تھی کہ بڑے اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ شریف ہے اس کو اور کسی لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ غالباً یہی وجہ تھی۔ ایک دن اس نے اپنی نوکرانی کے دس سالہ بچے کے ہاتھ اس کو یہ رقعہ لکھکر بھیج دیا۔

"آپ کی رقعہ نویسی پر مجھے اس کے سوا اور کوئی اعتراض نہیں کہ یہ شعروں میں نہ ہوا کرے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجھے چاندی اور سونے کے ہتھوڑوں سے کوٹ رہا ہے۔"

یہ خط لکھنے کے بعد جمال نے اشعار لکھنا چھوڑ دیئے، لیکن اس کی نثر ان سے بھی کہیں زیادہ جذبات سے پُر ہوتی تھی۔ زینت کی طبع پر یہ بھی گراں گزرتی، وہ سوچتی یہ کیا مصیبت ہے۔ وہ رات کو سوتی تو اپنا کمرہ بند کرکے قمیص اتار دیتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی نیند پر یہ ایک بوجھ سا ہوتا تھا۔ مگر جمال تو اس کی قمیص کے مقابلے میں کہیں زیادہ بوجھل تھا۔ وہ اُسے کبھی برداشت نہ کرسکتی۔ لیکن اس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ اس سے والہانہ محبت کرتا ہے

یہی وجہ ہے کہ زینت نے جمال کو کئی موقعے دیئے کہ وہ اس سے ہمکلام ہوسکے وہ اس سے جب پہلی بار ملا تو وہ کانپ رہا تھا۔ کانپتے کانپتے اور ڈرتے ڈرتے اس نے ایک ناول "بغیر عنوان کے" اپنی جیب سے نکالا۔ اور زینت کو پیش کیا: "اسے پڑھیے۔ میں۔ میں۔"

اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اور کانپتا لرزتا زینت کے گھر سے نکل گیا۔

زینت کو بڑا ترس آیا، لیکن اس نے سوچا کہ اچھا ہوا۔ اس لئے کہ اس کے پاس زیادہ

وقت تخلیے کے لئے نہیں تھا۔ اس کے ابا ٹھیک ساڑھے سات بجے آنے والے تھے اور جمال سوا سات بجے چلی دیا تھا۔

اس کے بعد جمال نے ملاقات کی درخواست کی تو زینت نے اُسے کہلا بھیجا کہ وہ اس سے پلازہ میں شام کا پہلا شو شروع ہونے سے دس منٹ پہلے مل سکیگی۔ زینت وہاں پندرہ منٹ پہلے پہنچی۔ جو سہیلی اس کے ساتھ تھی اس کو کسی بہانے ادھر اُدھر کر دیا دس منٹ اُس نے باہر گیٹ کے پاس جمال کا انتظار کیا جب وہ نہ آیا۔ تو کسی تکرار کے بغیر وہاں سے ہٹی اور اپنی سہیلی کو تلاش کر کے اندر سینما میں چلی گئی۔

جمال اس وقت پہنچا۔ جب وہ فسٹ کلاس میں داخل ہو رہی تھی۔ زینت نے اُسے دیکھا اس کے ملتجی چہرے اور اس کی معافی کی خواستگار آنکھوں کو۔ مگر اس نے اس کو گیٹ کیپر کی بھی حیثیت نہ دی اور اندر داخل ہو گئی۔ شو چونکہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے اتنی نوازش کی کہ جمال کی طرف دیکھ کر گیٹ کیپر سے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ ہم لیٹ ہو گئے"

جمال شو ختم ہونے تک باہر کھڑا رہا۔ جب لوگوں کا ہجوم سینما کی بلڈنگ سے اُگلا تو اس نے زینت کو دیکھا۔ آگے بڑھ کے اس سے بات کرنا چاہی مگر اس نے اس کے ساتھ بالکل اجنبیوں سا سلوک کیا۔ چنانچہ اسے مایوس گھر لوٹنا پڑا۔

اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بال بنوانے اور نہا دھو کر کپڑے پہننے میں اُسے دیر ہو گئی تھی۔ اس نے رات کو بڑی سوچ بچار کے بعد ایک خط لکھا جو عذرت نامہ تھا۔ اور زینت کو پہنچا دیا۔ یہ خط پڑھ کر جب وہ مقررہ وقت پر کوٹھے پر آئی اور جمال نے اس کے تیوروں سے محسوس کیا کہ اُسے بخش دیا گیا ہے۔

اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ زینت کو جمال سے یہ شکایت رہتی کہ وہ خط بہت لمبے لکھتا ہے۔ جو ضرورت سے زیادہ جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہ اختصار کی قائل تھی۔ محبت اس کو بھی جمال سے ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس کے اظہار میں اپنی طبیعت کے موافق کفایت برتتی تھی۔

آخر ایک دن ایسا آیا کہ زینت شادی پہ آمادہ ہو گئی۔ مگر ادھر اُدھر دونوں کے والدین رضامند نہیں ہوتے تھے۔ بہرحال بڑی مشکلوں کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور جمال کے گھر زینت دُلہن بن کے پہنچ گئی۔ حجلۂ عروسی سجا ہوا تھا۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ جمال کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا عشق و محبت کا۔ اس نے چنانچہ عجیب و غریب حرکتیں کیں۔ زینت کو سر سے پاؤں تک اپنے ہونٹوں کی سجدہ گاہ بنا ڈالا۔

زینت کو جذبات کا یہ بے پناہ بہاؤ پسند نہ آیا۔ وہ اُکتا گئی۔ ٹھیک دس بجے سو جانے کی عادی تھی۔ اس نے جمال کے تمام جذبات ایک طرف جھٹک دیئے اور سو گئی۔

جمال نے ساری رات جاگ کر کاٹی۔ زینت حسبِ معمول صبح ٹھیک چھ بجے اُٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ باہر نکلی تو اپنے ٹخنوں تک لمبے بالوں کا بڑی چابکدستی سے جوڑا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ جمال سے مخاطب ہوئی اور کہا۔ "ڈارلنگ! مجھے بڑا افسوس ہے"۔

جمال اس ننھے سے جملے ہی سے خوش ہو گیا۔ جیسے کسی بچّے کو کھلونا مل گیا ہے اس نے دل ہی دل میں اس فضا ہی کو چومنا شروع کر دیا جس میں کہ زینت سانس لے رہی تھی۔

وہ اُس سے والہانہ طور پر محبت کرتا۔ اس قدر شدید انداز میں کہ زینت کی مقدار پسند طبیعت برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک طریقہ بن

جائے۔ جس کے مطابق جمال اپنے عشق و محبت کا اظہار کرے۔

ایک دن اس نے جمال سے کہا: "آپ مجھ سے یقیناً ناراض ہو جاتے ہونگے کہ میری طرف سے آپ کی محبت کا جواب تار کے سے اختصار میں ملتا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے آپ کی محبت کی میں قدر کرتی ہوں مجھے بھی آپ سے پیار ہے۔ لیکن پیار مصیبت نہیں بن جانا چاہیئے۔ آپکا پیار بعض اوقات میرے لئے بہت بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

جمال نے بہت خیال رکھا۔ اب تو لکر اپنی بیوی سے محبت کرنے کی سعی کی مگر ناکام رہا۔ وہ طبعاً انتہا پسند تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی۔

زینت نے سوچا کہ طلاق ہی بہترین صورت ہے جو بدمزگی دور کر سکتی ہے۔ چنانچہ جمال سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اس نے طلاق کے لئے جمال کو لکھوا بھیجا۔ اس نے جواب دیا۔ کہ مر جائے گا مگر طلاق نہیں دے گا۔ وہ اپنی محبت کا گلا ایسے بے رحم طریقے سے گھونٹنا نہیں چاہتا۔

زینت کے لئے جمال کی یہ محبت بہت بڑی مصیبت بن گئی تھی۔ اُس نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کیا۔

عدالت میں پہلے روز جب فریقین حاضر ہوئے تو عجیب تماشا ہوا۔ جمال نے زینت کو دیکھا۔ تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے وکیل نے مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ سماعت کسی دوسری تاریخ پر ملتوی کر دی جائے۔ زینت کو بڑی کوفت ہوئی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ جلد کوئی فیصلہ ہو۔

اگلی تاریخ پر جمال حاضر عدالت نہ ہوا۔ زینت کو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ دوسرے مہینے کی تاریخ پر بھی وہ نہ آیا۔ تو زینت نے ایک رقعہ لکھکر جمال کو بھیجا کہ وہ اسے پریشان نہ کرے اور اب کی جو تاریخ مقرر ہوئی ہے اس پر وہ ضرور آئے اور ٹھیک وقت پر آئے۔

تاریخ سولہ اگست تھی۔ رات سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زینت حسب معمول صبح چھ بجے اُٹھی۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے اور اپنے وکیل کے ساتھ ٹانگے میں عدالت پہنچ گئی۔

اس کو یقین تھا کہ جمال وہاں موجود ہو گا۔ اس لئے کہ اُس نے اس کو لکھ بھیجا تھا کہ وقت پر پہنچ جائے۔ مگر جب اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور اُسے جمال نظر نہ آیا۔ تو اس کو بہت غصہ آیا۔

مقدمہ اس دن سر فہرست تھا۔ مجسٹریٹ نے عدالت میں داخل ہوتے ہی تھوڑی دیر کے بعد جمال اور زینت کو بُلایا۔ زینت اندر جانے ہی والی تھی۔ کہ اس کو جمال کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ بالوں میں کیچڑ، کپڑوں پہ خون کے دھبے۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ اس کے پاس آیا۔ اور معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ زینت مجھے افسوس ہے۔ میری موٹر سائیکل پھسل گئی اور میں ......"

جمال کے ماتھے پر گہرا زخم تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔ زینت نے اپنا دوپٹہ پھاڑا اور پٹی بنا کر اس پہ باندھ دی۔ اور جمال نے جذبات سے مغلوب ہو کر

وہیں عدالت کے باہر جہاں سینکڑوں آدمی موجود تھے۔ زینت کا منہ چوم لیا۔ اُس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ اپنے وکیل سے کہا کہ وہ طلاق لینا نہیں چاہتی۔ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔

جمال دس دن ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں زینت اس کی بڑی محبت سے تیمارداری کرتی رہی۔ آخری دن جب جمال مشین پر اپنا وزن دیکھ رہا تھا۔ تو اس نے زینت سے دبی زبان میں پوچھا "میں اب تم سے کتنی محبت کر سکتا ہوں؟"

زینت مسکرائی "ایک من"

جمال نے وزن کرنے والی مشین کی سوئی دیکھی۔ اور زینت سے کہا۔ "مگر میرا وزن تو ایک من تیس سیر ہے۔ میں یہ فالتو تیس سیر کہاں غائب کروں؟"

زینت ہنسنے لگی۔

گاف گُم

حامد :- (ٹائپ کرتے ہوئے) پا.... کس.... تان.... میں..... تع..
..... بی..... می..... فلم..... نہیں نہیں..... (کاٹ کر) فلمو
..... ں..... کی..... اہمیت..... پر..... ابھی تک..... غور.....
نہیں..... کیا..... گیا..... لیکن یہ گاف کدھر گیا..... ارے یہ بیچ بیچ
یہ گاف کدھر ہے..... لاحول ولا..... ارے بیچ بیچ یہ گاف کدھر ہے لاحول
ولا ملتا ہی نہیں۔

(سلیمان داخل ہوتا ہے)

سلیمان :- کیا نہیں ملتا؟

حامد :- گاف نہیں مل رہا یار۔

سلیمان :- (حیرت سے) گاف؟

حامد :- ہاں بھئی گاف۔ ابھی یہاں تھا خدا معلوم کہاں غائب ہو گیا؟

سلیمان:۔ (اور زیادہ حیرت سے) کون ہے یہ گاف!
حامد:۔ گاف کا بڑا بھائی۔
سلیمان:۔ (الجھتے ہوئے) اوہ .... تو آپ تھانے میں رپٹ کیوں نہیں لکھواتے؟
حامد:۔ (چلا کر) مل گیا۔ مل گیا (زور سے "ک" پر انگلی مارتے ہوئے) ہاں تیری ..... (عبارت پڑھتے ہوئے) پاکستان کی .... نہیں نہیں .... پاکستان میں تعلیمی فلموں کی اہمیت پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا۔ اس کم بخت گاف نے تو مجھے پریشان کر دیا تھا۔ کچھ دیر اور اس طرح غائب رہتا۔ تو یہ مضمون یہیں کا یہیں دھرا رہ جاتا۔
سلمان:۔ تو آپ فلمستان میں پاکستانی فلموں کی اہمیت پر غور فرما رہے ہیں۔
حامد:۔ جی نہیں میں تعلیمستان میں غور کی فلموں پر اہمیت فرما رہا ہوں۔
سلمان:۔ ہنستا ہے۔
حامد:۔ قبلہ سلمان صاحب آپ اس وقت تشریف لے جائیے مجھے واقعی پاکستان میں تعلیمی فلموں پر غور کرنا ہے۔
سلمان:۔ میں ابھی تشریف لے جاتا ہوں۔ لیکن آپ پہلے میرے ایک دو سوالوں کا جواب دے دیجئے۔
حامد:۔ فرمائیے۔
سلمان:۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ آپ کے پاکستان بنے کو۔ درست ہے نا؟
حامد:۔ جی ہاں!
سلمان:۔ آپ کے ہاں گنتی کے سٹوڈیو تھے۔ ایک تو شاید جل چکا ہے۔ کاریگر

موجود نہیں۔ ساز و سامان کی کمی ہے عام تفریحی فلم تو بن نہیں سکتے۔ سمجھ میں نہیں آتا آپ اپنا نیا اردو ٹائپ رائیٹر لے کر تعلیمی فلموں پر کیوں غور فرمارہے ہیں۔

حامد:۔ تمہاری گفتگو کا کوئی پہلو طنز سے خالی نہیں ہوتا۔

سلمان:۔ حامد صاحب۔ آپ میرے سوال کا جواب دیجیے۔

حامد۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جو چیز ہمارے پاس نہیں ہمیں بنانا ہے۔

سلمان:۔ بڑے شوق سے بنائیے: . . . خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ لیکن حضرت ہر کام شروع کرنے سے پہلے سوچنا سمجھنا تو ضروری ہے اناڑیوں کی طرح شروع کیجیے۔ تو قدم قدم پہ آپ کے ٹائپ رائیٹروں کا گم ہو جایا کرےگا

حامد:۔ (جز بز ہو کر) بکواس نہ کرو۔

سلیمان:۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے دماغ کا توازن بگڑ گیا۔ اب آپ میری منطق کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔۔۔ ایک سگرٹ مرحمت فرما سکتے ہیں آپ؟

حامد:۔ جی نہیں۔ دام بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے پینے چھوڑ دیئے ہیں۔

سلمان:۔ مبارک ہو . . . اپنا سگرٹ سلگانے کی تو اجازت ہے مجھے۔ (سگرٹ سلگاتا ہے)

حامد:۔ (جھپٹا مار کر سگرٹ کی ڈبیا چھینتے ہوئے) ادھر لاؤ ایک . . . کمینے کہیں کے۔

سلمان:۔ (مسکراتے ہوئے) آپ پوری ڈبیا لے سکتے ہیں۔ لیکن قبلہ میں کمینہ نہیں۔

حامد:۔ خیر نہ سہی سگرٹ تو دو۔

سلمان :- کتنی جلدی مان لیا آپ نے۔ اسے کہتے ہیں ایمان کی کمزوری۔

حامد :- اسگرٹ سلگا کر، بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم ؟

سلمان :- میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ میرے بتانے پر آپ کا فوراً ہی مان لینا کمینہ نہیں۔ آپ کے ایمان کی کمزوری ہے۔

حامد :- آپ اوندھی کھوپڑی کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ غلطی تسلیم کرنا ایک بہت بڑا بہادرانہ فعل ہے۔

سلمان :- آپ ایک اور غلطی تسلیم کر کے اور بہت بڑے بہادرانہ فعل کو سرانجام دیجئے کہ پاکستان میں یہ جو آپ تعلیمی فلموں کی اہمیت پر غور فرما رہے ہیں۔ فضول ہے۔

حامد :- تم دلائل سے ثابت کر دو میں مان جاؤں گا۔

سلمان :- شاباش ۔ ۔ ۔ ۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ ٹھہریئے پہلے میں اپنے دماغ کا ٹائپ رائیٹر درست کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ لگاف گم ہو جائے

حامد :- ہنستا ہے) ٹھیک ہو گیا۔

سلمان :- جی ہاں۔ خدا کے فضل و کرم سے دکھائی دیتا ہے، اچھا قبلہ! فرمایئے ہمارے اس طرف جسے کبھی ہندوستان کہتے تھے۔ فلم انڈسٹری قائم ہوئے کتنے برس ہو چلے ہیں۔

حامد :- قریب قریب چالیس برس۔

سلمان :- ان قریب قریب چالیس برسوں میں اس صنعت نے آپ کے خیال کے مطابق خاطر خواہ ترقی کی ہے یا نہیں ؟

حامد:۔ نہیں۔

سلمان:۔ کیوں ؟

حامد:۔ بہت سی وجوہ ہیں۔

سلمان:۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگوں نے مضمون نویسی پہ زور زیادہ دیا اور صحیح عملی کاموں پہ کم۔

حامد:۔ کیا تم ذاتیات سے علیٰحدہ نہیں رہ سکتے؟

سلمان:۔ جی نہیں۔ اس لئے کہ آپ کی ذات سے پاکستان کی فلمی صنعت سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ شرمائیے نہیں۔ یہ واقعہ ہے مگر کسر صرف اتنی ہے کہ آپ دوسرے پاکستانیوں کی طرح جذبات میں اُلجھ کر اپنا صحیح راستہ بھول جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ کا گاف گم ہو جاتا ہے۔

حامد:۔ (ہنستا ہے) اگاف کے پیچھے تم بہت بُری طرح پڑے ہو۔

سلمان:۔ پڑنا چاہیئے۔ گناہ کا پہلا حرف کم بخت ۔۔۔ گندگی میں یہی سب سے پہلے ۔۔۔۔ اور جب گم ہوتا ہے تو یہی پہلے گم ہوتا ہے۔

حامد:۔ (ہنستا ہے) آدمی ذہین ہیں آپ فلمان صاحب!

سلمان:۔ آپ نے پھر غلطی کی ۔۔۔۔ کوئی لفظ بنانا ہی تھا۔ تو یوں بنایا ہوتا علم کے وزن پر علم اس سے عالم بنا۔ قلم سے قالم۔ ذرا آگے چلیے۔ علم سے علّامہ۔ قلم سے قلّامہ۔

حامد:۔ (ہنستا ہے) لو آج سے ہو گیا۔ قلّامہ اجل سلمان ۔۔۔۔

سلمان :- تسلیم عرض کرتا ہوں۔ اور اصل موضوع سے ہٹ جانے پر معذرت طلب کرتا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا۔ کہ فلمی صنعت نے یہاں بالکل خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد اس صنعت کا جو کچھ بھی یہاں بچا ہے ظاہر ہے کہ اس پر چھاپ ہی ہندوستانی ہے۔ اس میں جو بُرائی اور کمی ہے ظاہر ہے کہ وہ بھی ہماری پُرانی بُرائی اور کمزوری ہے۔

حامد :- درست ہے۔

سلمان :- اس طرح پاکستان میں تعلیمی فلموں کی اہمیت پر غور نہیں کیا گیا۔ تو اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ سرے ہی سے اس پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ بھی سوچنا ہے کہ اس مسئلے پر ہمیں سوچنے کا موقعہ ہی کہاں ملا ہے! ہمارے فلمسازوں نے ابھی عام تفریحی فلم ہی نہیں بنائے۔ تعلیمی فلم تو بہت بعد کی چیز ہے۔

حامد :- سچ کہتے تو ٹھیک ہو۔

سلمان :- بھائی صاحب! میں ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا ہوں۔ پر مصیبت یہ ہے۔ کہ میرا واسطہ پڑتا ہے آپ ایسے جذباتی لوگوں سے جو کنواں کھودنے سے پہلے ہاتھوں میں ڈول لئے گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ پاکستان میں آپ شوق سے تعلیمی فلم بنائیے۔ ایک نہیں ہزار بنائیے اور ان کی اہمیت پر کسی کافر کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سب سے پہلے آپ اپنے عام تفریحی فلموں کا اسٹنڈرڈ اونچا کیجئے۔ رجی نہیں بلکہ سب سے پہلے آپ اپنے تماشائیوں کو فلم دیکھنے کا سلیقہ سکھائیے۔

حامد :- کیا مطلب!

سلمان :- میں عرض کرتا ہوں۔ (عورتیں ہنستی ہوئی اندر داخل ہوتی ہیں) ۔ ۔ ۔ تو

بھئی میرا تو لگا ٹ گم ہو گیا۔
تشریف لے آئیں میری زوجہ محترمہ۔ ۔ ۔ ۔

حامد:- میری بھی ہمراہ ہیں۔

مسرت:- آداب عرض سلمان صاحب۔

سلمان:- تسلیمات۔

عفت:- حامد بھائی سلام۔

حامد:- وعلیکم السلام

عفت:- مسرت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بیٹھے کوئی سازش کر رہے تھے۔

سلمان:- جی ہاں۔ بہت گہری سازش۔

مسرت:- ہمیں شامل نہ کیجئے گا اس میں۔

حامد:- نہیں۔

مسرت:- کیوں

حامد:- خلاصہ اجل سلمان صاحب جواب دیجئے۔

سلمان:- بتا نا میں تمہارے پاس کس لئے آیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ہاں سر درد کی دوا
لینے مگر تم کو دیکھا تو ایک لحظہ کے لئے بھول گیا کہ سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا

حامد:- (مسکراتے ہوئے) ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق۔

مسرت:- خاک بھی رونق نہیں ۔ بہت برا حال ہے ان کا ۔ درد کے مارے
پھٹا جا رہا ہے ۔ سو اس کا ایک ہی علاج ہے ۔ کیوں عفی؟

عفت:- بالکل۔

سلمان :- جو بیمار ہے اس کو تو علاج بتایا ہی نہیں تم نے۔

مسرت :- درد دل دیکھئے۔

عفت :- ایک درد دوسرے درد کو بالکل دور کر دے گا۔

سلمان :- اور جو یہ ساتھ ہی چمیٹ گیا کم بخت!

مسرت :- حامد بھائی۔ آپ ان سے کہیں کہ ہمارے ساتھ درد دل دیکھنے چلیں۔

حامد :- چلا جائے گا۔ اگر عفی مجھے معاف رکھے۔

عفت :- اجی خواہ! آپ تو سب سے پہلے چلیں گے۔۔۔۔۔ اٹھئے۔۔۔ اٹھئے

مسرت :- آپ بھی اٹھئے سلمان صاحب۔

سلمان :- آج پہلا دن ہے مسرت بہت رش ہو گا۔

حامد :- چلو سلمان چلتے ہیں۔

عفت :- دیکھا مسرت میرے شوہر تو ڈبیا میں بند رکھنے کے قابل ہیں۔

حامد :- خدا کے لئے ابھی بند کر دو مجھے۔

عفت :- پہلے پکچر دیکھنے چلیں۔ بعد دیکھا جائے گا۔

سلمان :- لیکن میں کہتا ہوں حامد، یہ دو ہیں۔ چلی جائیں ہمارے بغیر۔

عفت :- بھائی جان! اب آپ زیادہ باتیں نہ کیجئے۔ شو کا وقت ہو رہا ہے۔

سلمان :- چلئے جناب۔

حامد :- چلو عفت

عفت :- ٹھہریئے۔۔۔۔ آؤ مسرت۔۔۔۔۔۔ ذرا ہم۔۔۔۔

حامد :- زیادہ بناؤ سنگار اچھا نہیں ہوتا جناب۔

عفت :- آپ گاڑی نکالیئے۔ ہم ابھی آتی ہیں۔

حامد :- چلو بھئی سلمان۔

(دونوں باہر نکلتے ہیں)

سینما ہال کے باہر۔

مسرت :- اُف توبہ! کتنی بھیڑ ہے۔

سلمان :- میں نے تم سے کہا تھا۔ آج۔ پہلا شو ہے بہت رش ہوگا۔

مسرت :- تو کیا ہوا۔ حامد بھائی آپ کی طرح سُست نہیں۔ یوں چٹکیوں میں ٹکٹ لے آئیں گے۔

سلیمان :- غریب پس رہا ہوگا۔

عفت :- وہ آگئے۔

سلمان :- ذرا حلیہ ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کشتی لڑ کے آ رہے ہیں۔

مسرت :- ٹکٹ مل گئے حامد بھائی۔

حامد :- جی نہیں۔ ہاؤس فل ہے۔ لیکن کتنے بدتمیز ہیں یہ لوگ۔

عفت :- کیا ہوا؟

حامد :- یہ دیکھو ہیٹ کا کیا ناس مار گیا ہے۔

(بلیک میں ٹکٹ بیچنے والے کی صدا آتی ہے)

ٹکٹ بیچنے والا :- ڈھائی روپے کا تین روپے میں۔

مسرت :- یہ ٹکٹ مل تو رہے ہیں

ٹکٹ والا :- کتنے چاہئیں میم صاحب۔

مسرت :- میں نے تم سے بات ہیں کی۔

ٹکٹ والا :- اللہ رے دماغ ...... ڈھائی کا تین ہیں .... ڈھائی کا تین ہیں ... سمجھ لینا چاہیئے۔ پہلے مجھے سلام کرے۔

مسرت :- بدتمیز کہیں کا۔

سلمان :- کہیں کا نہیں یہیں کا ہے۔

حامد :- ہنستا ہے۔

عفت :- سلمان صاحب یہ ڈھائی کا ٹکٹ تین میں کیوں بیچ رہا تھا۔

سلمان :- تاکہ آپ جیسی میم صاحبوں کو آسانی سے مل جائے۔

حامد :- ہوں۔ صریحاً بلیک مارکیٹ کر رہا ہے۔

سلمان :- آپ کچھ بھی کہہ لیجئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت وہ مارکیٹ میں پیش کر رہا ہے۔

حامد :- بس تم ہر چیز کو اپنی ترچھی نگاہ سے دیکھو گے۔

سلمان :- آپ بھی اس نگاہ سے دیکھیں، تو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ لوگ بہت بڑے نبض شناس ہیں۔ ان کا وجود ہم شریف آدمیوں کے لئے باعث رحمت ہے۔

مسرت :- ماشاءاللہ

سلمان :- چشم بد دور بھی کہو۔ مذاق نہیں کر رہا حامد۔ تمہارا اچکلس روپے کا فیلٹ ہیٹ میدہ ہونے سے یقیناً بچ جاتا۔ اگر تم نے چپکے سے اس آدمی سے دو روپے زیادہ خرچ کر کے ٹکٹ لے لئے ہوتے۔

مسرت :- یہ تو ٹھیک ہے۔

سلمان :- کہنا ہمیشہ ہی ٹھیک رہوں۔ لیکن آپ لوگ مانتے بہت دیر میں ہیں (ٹکٹ والے کو آواز دیتا ہے) میاں ٹکٹ فروش۔

ٹکٹ والا :- دور سے مجھے بلایا ہے آپ نے۔

سلمان :- جی ہاں۔

حامد :- (ہنستا ہے)

سلمان :- معافی چاہتا ہوں۔ اور سلام عرض کر کے چار ٹکٹ آپ کے مقرر کردہ کنٹرول ریٹ پر لینے کی جرات کرتا ہوں۔

ٹکٹ والا۔ تم آدمی اچھے معلوم ہوتے ہو۔

سلمان :- تسلیم عرض کرتا ہوں۔ آپ پہلے شخص ہیں۔ جس نے بروقت داد دی ہے۔

ٹکٹ والا :- (مسکراتا ہے) یہ لیجئے چار ٹکٹ — آپ سے ڈھائی ڈھائی روپے ہی لئے جاسکتے ہیں۔

سلمان :- بڑی نوازش ہے آپ کی۔

ٹکٹ والا۔ نوازش وازش کچھ نہیں۔ لیکن آپ کی بیگم صاحبہ سے کہہ دیجئے کہ سینما آتے وقت مزاج گھر چھوڑ آیا کریں۔ ورنہ دیتے ہوتے ڈھائی روپے کا ٹکٹ سوا تین لئے ہیں ---- ڈھائی روپے کا ٹکٹ سوا تین بنتے ہیں۔ ریٹ بڑھا دیئے سرکار نے۔

(حامد اور سلمان دونوں ہنستے ہیں)

مسرت :- ذرا سرکار کی شکل دیکھئے۔

سلمان:- دردِ دل" نہ دیکھئے گا

مسرت:- ہاں سچ۔ وقت ہو گیا ہے۔ چلو عفت۔

سینما ہال کے اندر۔

مسرت:- اُف! کس قدر اندھیرا ہے؟

عفت:- کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

حامد:- تم میری انگلی پکڑ لو۔ لاؤ! ادھر۔

ایک عورت:- معاف کیجئے گا یہ میری انگلی ہے۔

حامد:- (ہکلاکر) م۔م۔ معا۔ معاف کیجئے گا۔

(مسرت اور عفت کی دبی دبی ہنسی)

ایک تماشائی:- خاموش۔ کون ہنس رہا ہے؟

سلمان:- مجھے تو بڑی اچھی گدے دار سیٹ مل گئی ہے۔

دوسرا تماشائی:- معاف کیجئے گا۔ آپ مجھ پر تشریف فرما ہیں۔

سلمان:- (ایک دم اُٹھکر) اوہ۔۔۔

(حامد، عفت اور مسرت سب کھل کھلا کر ہنستے ہیں)

تماشائی:- (بیک وقت) خاموش، خاموش۔

سلمان:- (آہستہ سے) بیٹھ جائیے سب۔ پکچر شروع ہونے والی ہے

(ایک چھوٹے بچے کی رونے کی آواز آتی ہے، ہجوم کا ردِ عمل، قہقہے، سیٹیاں

خاموش کراؤ۔ خاموش کراؤ کی بلند آوازیں)

سلمان:- پاکستان کے شیر خوار بچوں کے دل میں دردِ پیدا کرنے کے لئے فرما

ہے کہ انہیں شروع ہی سے فلم دکھائے جائیں۔ نوٹ کر لو حامد۔

حامد :۔ (آہستہ) وہ دیکھو پردے پر ہیروئن نمودار ہوگئی۔

سلمان :۔ گانا شروع کرے گی۔ تو فوراً مان لوں گا۔

(میوزک کا افتتاحی ٹکڑا ذیل کے گیت میں تحلیل ہو جاتا ہے)

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

کیا کہوں کچھ بھی کہہ نہیں سکتی

اور کہے بن میں رہ نہیں سکتی

کیا بتاؤں معاملہ کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دل میں سو سو خیال آتے ہیں

ایسے آتے ہیں جیسے جاتے ہیں

(ایک دم کچھ کھٹ پٹ ہوتی ہے اور گیت ایک دھچکے کے ساتھ بند ہو جاتا ہے۔ اس پر ہجوم بہت شور برپا کرتا ہے۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ شور ختم ہو جاتا ہے)

(واپس گھر میں)

مسرت :۔ لاحول ولا۔ کتنا بُرا انتظام ہے ان سینما گھروں میں۔

سلمان :۔ تم بُرا ہرگز نہیں کہہ سکتیں۔

مسرت :۔ کیوں؟

سلمان :- جو چیز ہو اُسے اچھا بُرا کہا جا سکتا ہے۔ مگر جو چیز سرے سے موجود ہی نہیں، اس پر رائے زنی کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں۔

مسرت :- (جلا کر) میں آپ کی کج بحثی سے تنگ آگئی ہوں۔

سلمان :- تم بھی حامد کی طرح ہر چیز سے جو صحیح ہو تنگ آ جاتی ہو۔

حامد :- مجھے ابھی تھوڑی دیر کے لئے بخش دو میں اپنا ہیٹ درست کر رہا ہوں۔

سلمان :- یہ قیامت تک درست نہیں ہو گا۔ ادھر تشریف لائیے پاکستان میں تعلیمی فلموں پر غور کریں۔

مسرت :- ہائے اللہ! یہ میری ساڑھی کو کیا ہو گیا؟

عفت :- دیکھوں تو!

مسرت :- پورے روپے برابر جل گئی۔

سلمان :- پرانے پائے روپے برابر۔

مسرت :- (جل کر) میرا نقصان ہو گیا ہے اور آپ کو ہنسی سوجھتی ہے۔ اللہ کرے اُسکی دونوں آنکھیں پھوٹیں جس نے میری جارجٹ کی نئی ساڑھی غارت کی۔

سلمان :- ایک آنکھ تو رہنے دی ہوتی غریب کی۔ سینما دیکھنے کا شوقین ہے۔

عفت :- پکچر ہاؤس میں سگریٹ پینے کی سخت ممانعت ہونی چاہیئے۔

سلمان :- اور عورتوں کو اپنے شیر خوار بچے ساتھ لانے کی کھلی اجازت۔ اور پان کھانے والیوں اور والوں کے لئے پیکدان مفت چاہئیں۔

حامد :- مذاق بر طرف یہ ہمارے سینما گھر اچھی خاصی بک بک ہیں۔

سلمان :- کیا کہوں۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، اور کہے بن میں رہ نہیں سکتے کہ سب سے پہلے تعلیمی فلم بنانے والوں، فلم دکھانے والوں کے لئے فلم بنانے چاہئیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو تعلیم تدریس کے لئے اسکول میں طالب علموں کو لیکچر دینے اُٹھ کھڑے اور ان۔ کہیں گے کہ تمہیں اچھی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ حالانکہ صحیح راستہ یہ ہے کہ نصاب مقرر کرنے والوں کی گوشمالی کی جائے۔

مسرت :- چلو عفتی۔ یہ ساڑھی رفو کرنے کے لئے دے آئیں۔

عفت :- چلو۔ (قدموں کی چاپ)

سلیمان :- حامد۔ میں تم سے ایک بات کہوں ؟

حامد :- کہو۔

سلیمان :- پاکستان میں سب سے پہلے ہمیں ایسے رفوگروں کی اہمیت پر غور کرنا چاہیئے۔ جو ہماری معاشرت کے چاک سی سکیں۔ میں سچ کہتا ہوں نئے کپڑے بنانے سے پہلے ان پھٹے پرانے کپڑوں ہی کے متعلق سوچنا چاہیئے۔ جو ہمارے تن پر باقی بچے ہیں۔ جان من۔ یہ جذباتی بننے کا وقت نہیں۔ جو نہیں ہے بن جائے گا۔ آہستہ آہستہ لیکن جو ہے اس کی حالت سدھارنے کے لئے سوچنا چاہیئے۔ ہمارے فلم ساز کسی اور ہی ماحول کے عادی تھے۔ اب اگر انہیں زندہ رہنا ہے اور ان فلم سازوں کا مقابلہ کرنا ہے جو کبھی ان کے شریک گناہ و ثواب تھے۔ تو انہیں یہاں کے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔ اور زندگی سے پہلے

صنعت گری کی طرف متوجہ ہونا ہوگا کہ یہی کلید حیات ہے۔

حامد:۔ ٹھہرو۔ مجھے یہ باتیں نوٹ کر لینے دو۔

سلمان:۔ ٹھہرو۔ پہلے مجھے یہ پوچھنے دو کہ تفریحی اور تعلیمی فلموں میں تمہارے نزدیک کیا فرق ہے؟

حامد:۔ تفریحی اور تعلیمی فلموں میں یہ فرق ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (رک جاتا ہے)

سلمان:۔ کیا تم ہو گیا گیا؟

حامد:۔ اور کیا۔ تم سوال ہی کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے کرتے ہو۔

سلمان:۔ سنو۔ تفریحی فلم تعلیمی فلم بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے۔ کہ ہر فلم تعلیمی فلم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ کسی چیز کی تعلیم تو ضرور دیتا ہے۔ مگر تعلیمی فلموں سے تمہاری مراد شاید ایسے فلموں سے ہے۔ جو خاص خاص تعلیمی موضوعات پر انگلینڈ اور امریکہ میں تیار کئے جاتے ہیں۔

حامد:۔ میرا مطلب بالکل یہی تھا۔ تم خواہ مخواہ بوکھلا دیتے ہو۔

سلمان:۔ ایسی بوکھلاہٹ صحت مند ہے کیونکہ تم فوراً سمجھ جاتے ہو۔ اب ایک بار پھر بوکھلا جاؤ۔ اور سمجھو کہ ہمارے فلم ساز ایسے فلم اس وقت تک نہیں بنائیں گے جب تک حکومت انہیں مجبور نہیں کرے گی۔

حامد:۔ مجبوری میں انسان اچھا کام کر کیسے سکتا ہے۔

سلمان:۔ بھائی جان۔ فلمی دنیا ایک بالکل ہی دوسری دنیا ہے۔ پچھلے دنوں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں سرکار انگریزی نے تمام بڑے بڑے فلم سازوں کے نام احکام جاری کئے۔ کہ وہ ایک ایک پروپگنڈا فلم بھی

تیار کریں۔ یہ احکام پاکر فلم ساز بہت بٹ پٹائے۔ پھر جب فرار کا کوئی راستہ نہ ملا تو انہیں مجبوراً پروپاگنڈا اور تفریحی فلموں کو سمو کر ایسے فلم تیار کرتے ہی پڑے جن میں سے اکثر کامیاب ہوئے۔

حامد:۔ گنتی کے صرف تین چار فلم ایسے تھے۔

سلمان:۔ کچھ بھی ہو۔ مگر وہ چیز تو دور ہو گئی جس سے ہمارے فلم سازوں کو ڈر لگتا تھا۔ ان کو وہ خوف تو نہ رہا۔ کہ ایسے فلم جن کی پبلک عادی نہیں بہت بری طرح فیل ہوں گے۔

حامد:۔ یہ تو ہے۔

سلمان:۔ اگر یہ ہے تو ہمارے ہاں یقیناً ایسے تعلیمی فلم بن سکتے ہیں۔ جو آمدن کا بھی ذریعہ ہوں۔

حامد:۔ ٹھہرو۔ مجھے نوٹ کر لینے دو۔

سلمان:۔ کر لو۔

حامد:۔ (ایک دم چلا کر)۔ . . . ارے میرا فاؤنٹین پن کدھر گیا۔ باہر کی اس جیب میں تھا ۔۔۔ اڑا لے گیا کوئی سینما میں۔

سلمان:۔ دیکھو یہ تو نہیں۔

حامد:۔ یہی تو ہے۔ لیکن تمہارے پاس کیسے آیا؟

سلمان:۔ بجلی فیل ہوئی اور گڑبڑ مچی تو میں نے دیکھا۔ ایک صاحب جو از قسم جیب تراش تھے بڑے اطمینان سے تمہارے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اپنا محبوب شغل فرما رہے تھے

حامد:۔ تم اندھیرے میں بھی دیکھ لیتے ہو۔

سلمان :- میری آنکھیں تپی گئی ہیں۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گھڑی نکالتا ہے)
تو یہ اپنی گھڑی بھی لو۔

حامد :- گھڑی! (ہاتھ میں لے کر) یہ گھڑی تو میری نہیں۔

سلمان :- تمہاری نہیں۔ تو وہ غریب لُٹ گیا۔

حامد :- کون؟

سلمان :- وہی جو تمہارا پن اڑانا چاہتا تھا۔ (ہنستا ہے) کمال ہو گیا۔ میں نے
جب اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر تمہارا پن اور یہ گھڑی نکالی۔ تو اس
غریب نے ڈر کے مارے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ بہر حال اب
یہ سوچنا ہے کہ گھڑی کا کیا کیا جائے۔

حامد :- یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔

سلمان :- فی الحال اپنی جیب میں رکھتا ہوں، اور اسے ایمان داری سے
وقت بتلانے کا عادی کرتا ہوں۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ کس آدمی
کے گھر ڈالا جائے۔

"نفسیات شناس"

آج میں آپ کو اپنی ایک پُر لطف حماقت کا قصّہ سناتا ہوں۔

کرفیو کے دن تھے۔ یعنی اُس زمانے میں جب بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز جب صبح سویرے اخبار آتا تو معلوم ہوتا، کہ متعدد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

میری بیوی اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں لاہور جا چکی تھی۔ گھر بالکل سُونا سُونا تھا۔ اُسے گھر تو نہیں کہنا چاہیئے، کیونکہ صرف دو کمرے تھے، ایک غسل خانہ جس میں سفید چمکیلی ٹائلیں لگی تھیں۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ایک اندھیرا سا باورچی خانہ، اور بس!

جب میری بیوی گھر میں تھی تو دو نوکر تھے۔ دونوں بھائی کم عمر تھے۔ اُن میں سے جو چھوٹا تھا۔ وہ مجھے قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار تھا۔ چنانچہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نکال باہر کیا۔ اور اس کی جگہ ایک اور لڑکا ملازم رکھ لیا۔ جس کا نام افتخار تھا۔

لکھنے کو تو میں نے اسے رکھ لیا، لیکن بعد میں بڑا افسوس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پھرتیلا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھا ہوں اور کوئی افسانہ سوچ رہا ہوں۔ کہ وہ باورچی خانہ سے بھاگا آیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہوا۔" صاحب آپ نے بلایا ہے مجھے!

میں حیران کہ اس خرذات کو میں نے کب بلایا تھا۔ چنانچہ میں نے شروع شروع تو اتنی حیرت کا اظہار کیا اور اس سے کہا۔ افتخار تمہارے کان بجتے ہیں۔ میں جب آواز دیا کروں۔ اسی وقت آیا کرو۔"

افتخار نے مجھ سے کہا:" لیکن صاحب آپ کی آواز سے سنائی دی تھی۔

میں نے اس سے بڑے نرم لہجے میں کہا:" نہیں میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔

وہ چلا گیا۔ لیکن جب ہر روز چھ چھ مرتبہ آکر یہی پوچھنے لگا:" صاحب آپ نے بلایا ہے مجھے؟" تو مجھے تنگ آکر اس سے یہ کہنا پڑا۔ تم بکواس کرتے ہو۔ تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے"! اور وہ بھاگ جاتا

گھر میں چونکہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میرا دوست راجہ مہدی علی خاں میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کو افتخار کی مستعدی بہت پسند تھی۔ وہ اس سے بہت متاثر تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا منٹو۔ تمہارا یہ نوکر کتنا اچھا ہے۔ ہر کام کتنی مستعدی سے کرتا ہے۔"

میں نے اس سے ہر بار یہی کہا۔ راجہ میری جان، تم مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ اگر اسے اپنے یہاں لے جاؤ۔ مجھے ایسے مستعد نوکر کی

ضرورت نہیں۔"

معلوم نہیں کہ راجہ کو اگر افتخار لپسند تھا تو اس نے اُسے ملازم کیوں رکھ لیا میں نے راجہ سے کہا: "دیکھو بھائی۔ یہ لڑکا بڑا خطرناک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چور ہے۔ کبھی نہ کبھی میرے پیچھے نہ ضرور لگے گا۔"

راجہ میرا تمسخر اُڑاتا: "تم فرائڈ بن رہے ہو۔ ایسا نوکر زندگی میں مشکل ملتا ہے تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔"

میں سوچ میں پڑ جاتا کہ میرا تیافہ یا اندازہ کہیں غلط تو نہیں۔ شاید راجہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے افتخار ایمان دار ہو اور وہ جو میں نے اس کی ضرورت سے زیادہ پھرتی اور چالاکی کے متعلق فیصلہ کیا ہے بہت ممکن ہے غلط ہو۔

مگر سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی درست ہے۔ مجھے اپنے متعلق یہ حسنِ ظن ہے کہ میں انسانی نفسیات کا ماہر ہوں۔ آپ یقین مانیے افتخار کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی بالکل درست نکلی —— لیکن ——"

یہ "لیکن" ہی سارا قصہ ہے۔

اور قصہ یوں ہے کہ میں جب بمبئی ٹاکیز سے واپس آیا کرتا تھا تو عادتاً ریل گاڑی کا ماہانہ ٹکٹ جو ایک کارڈ کی صورت میں ہوتا تھا اور سلولائیڈ کے کور میں بند رہتا تھا۔ اپنے میز کے دراز میں رکھ دیا کرتا تھا جتنے روپے پیسے، اور آنے جیب میں ہوتے، وہ بھی اس دراز میں رکھ دیتا

تھا۔ اگر کچھ نوٹ ہوں، تو وہ بھی ٹکٹ کے اس سلولائڈ کے کور میں اڑس دیا کرتا

ایک دن جب میں بمبئی ٹاکیز سے واپس آیا تو میری جیب میں ساٹھ روپے کی مالیت کے چھ نوٹ دس دس کے تھے۔ میں نے حسب عادت جیب میں سے ٹرین کا پاس نکالا۔ اس کو سلولائیڈ کور میں چھ نوٹ اڑسے اور برانڈی پینے لگا۔ کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔

صبح جلد بیدار ہوتا ہوں۔ یعنی یہی کوئی پانچ بجے۔ ساڑھے پانچ کے قریب اخبار آجاتے تھے۔ ان کا جلدی جلدی مطالعہ کرتے کرتے چھ بجتے تو میں اٹھ کر غسل کرتا۔ اس کے بعد پھر برانڈی پیتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔

اس شام بھی ایسا ہی ہوا۔ افتخار نے بڑی پھرتی سے میز پر کھانا لگایا جب میں کھا کر فارغ ہوا تو اس نے اور زیادہ پھرتی سے برتن اٹھائے، میز صاف کی اور مجھ سے کہا: "صاحب آپ کو سگرٹ چاہئیں۔"

میں اس سے کباب تھا، چنانچہ میں نے اس سے بڑے درشت لہجے میں کہا: "سگرٹ تو مجھے چاہئیں، لیکن تم لاؤ گے کہاں سے؟ جانتے نہیں ہو آج کرفیو ہے، نو بجے سے صبح چھ بجے تک!"

افتخار خاموش ہو گیا۔

میں صبح حسب معمول پانچ بجے اٹھا لیکن سمجھ میں نہ آیا کیا کروں نوکر سوئے تھے۔ کرفیو کا وقت چھ بجے تک تھا۔ اس لئے کوئی اخبار نہیں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھا اونگھتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اکتا کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو بازار

سنسان تھا۔ وہ بازار جو صبح تین بجے ہی ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ اور بل میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں کی تیز رفتاری سے زندہ ہو جاتا تھا۔

کھڑکی ایک ہی تھی۔ اس کے پاس ہی میری میز اُس پہ جو ٹرے پڑی تھی میری نظر اتفاقیہ اس پہ پڑی۔ شام کو ہر روز میں اس میں اپنا ریل کا پاس اور روپے پیسے رکھا کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ معاملہ عادت بن کر طبیعت بن گیا تھا جب میں نے "ٹرے" کو اتفاقیہ طور پر دیکھا۔ تو مجھے وہ پاس نظر نہ آیا۔ جس کے "کور" میں میں نے دس دس کے چھ کرنسی نوٹ رکھے تھے پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید میں نے کاغذوں کے نیچے رکھ دیا ہوگا۔ لیکن جب کاغذ اٹھائے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

بڑی حیرت ہوئی، ایک ایک کاغذ اُلٹ پلٹ گیا مگر وہ پاس، نہ ملا دونوں نوکر باورچی خانے میں سو رہے تھے۔ میں بڑا متحیر تھا کہ یہ قِصّہ کیا ہے، میں نے اگر گھر آنے سے پہلے شراب پی ہوتی تو میں سمجھتا کہ میرا حافظہ جواب دے گیا ہے یا جیب سے رومال نکالتے وقت مجھ سے وہ چھ نوٹ کہیں گر گئے ہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میں نے لمبئی ٹاکیز سے واپس گھر آتے ہوئے راستے میں ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا۔ اس لئے کہ گھر میں برانڈی کی پوری بوتل موجود تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر تلاش شروع کی۔ تو دیکھا میرا ریلوے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت میز کے نچلے دراز میں فائلوں کے نیچے پڑا ہے میں دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اس لئے کہ میں نے اس کو چھپا کر نہیں

رکھا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ افتخار کی حرکت ہے۔ اس نے جبکہ میں سو رہا تھا۔ باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر "ٹرے" میں وہ پاس دیکھا اور اس کو میز کے نچلے دراز میں فائلوں کے اندر چھپا دیا۔

رات کرفیو تھا۔ اس لئے وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی غالباً یہ اسکیم تھی کہ جب صبح کرفیو اُٹھے۔ تو وہ پاس نوٹوں سمیت لے کر چمپت ہو جائے مگر میں بھی ایک کائیاں تھا۔ میں نے پاس فائلوں کے نیچے سے اُٹھایا اور پھر ٹرے میں رکھ دیا۔ تاکہ میں افتخار کی پریشانی دیکھ سکوں۔

مجھے مقررہ وقت پر بمبئے ٹاکیز جانا تھا۔ چنانچہ حسب معمول میں نے کرتہ اور پاجامہ نکالا۔ پاجامہ میں آزار بند ڈالا۔ اور تولیہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ لیکن میرے دل و دماغ میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ اور وہ افتخار کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ وہ میری میز کے نچلے دراز میں چھپایا ہوا پاس بڑے وثوق سے نکالے گا۔ پھر جب اُسے نہیں ملے گا۔ تو وہ اِدھر اُدھر دیکھے گا۔ جب اسے ناکامی ہو گی۔ تو وہ اُٹھے گا۔ اس کی نظر ٹرے پر پڑے گی۔ وہ کس قدر حیران ہو گا۔ لیکن وہ پاس کو اُٹھائے گا اور اپنے نیفے میں اڑس کو چلتا بنے گا۔

میں نے اپنے دماغ میں یہ سکیم بنائی تھی۔ کہ غسل خانہ کا دروازہ کھلا رکھوں گا غسل خانہ کا دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھوں گا۔ غسل خانہ میرے کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ ذرا سا دروازہ کھلا رہتا۔ اور میں تاک میں رہتا تو

افتخار کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں جب غسل خانے میں داخل ہوا تو بہت مسرور تھا۔ بزعم خود نفسیاتی ماہر کی وجہ سے میں اور بھی زیادہ خوش تھا۔ کہ آج میری قابلیت مسلّم ہو جائے گی۔ افتخار کو پکڑ کر میں راجہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اُسے پولیس کے حوالے کر دوں۔ مجھے تو صرف اپنا دلی اور ذہنی اطمینان مطلوب تھا۔ چنانچہ میں نے غسل خانے میں داخل ہو کر جب اپنے کپڑے اتارے تو دروازہ سا کھلا رکھا۔

پانی کے دو ڈونگے اپنے بدن پر ڈال کر میں نے صابن ملنا شروع کیا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ میں نے جھانک کر کمرے کی طرف دیکھا۔ مگر افتخار پاس لینے نہ آیا۔ لیکن مجھے یقین واثق تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ اس لئے کہ اس وقت کرشیا اُٹھ چکا تھا جب میں فوارے کے نیچے بیٹھا اور اس کی تیز اور ٹھنڈی پھوار میں اپنا کام بھول گیا اور سوچنے لگا۔ افسانہ نگار ہونا بھی بہت بڑی لعنت ہے میں نے اسکیم کو افسانے کی شکل دینا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ نہاتا بھی رہا تا آنکہ ایسا وقت آیا کہ افسانے اور پانی میں غرق ہو گیا۔

میں نے پورا افسانہ صابن اور پانی سے دھو دھا کر اپنے دماغ میں صاف کر لیا۔ بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ اس افسانے کا انجام یہ تھا کہ میں نے اپنے نوکر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اور میری نفسیات شناسی کی چاروں طرف دھوم مچ گئی ہے۔ میں بہت خوش تھا۔ چنانچہ میں نے خلاف معمول اپنے بدن پر ضرورت سے زیادہ صابن ملا۔ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کیا۔ لیکن ایک بات تھی کہ افسانہ میرے دماغ میں اور

زیادہ صاف اور زیادہ اُجلا ہوتا گیا۔

جب نہا کر باہر نکلا تو میں اور بھی زیادہ خوش تھا۔ اس لئے کہ پورا افسانہ میں نے صابن اور پانی کے ساتھ اپنے دماغ میں لکھ لیا تھا۔ اب صرف یہ کرنا تھا کہ قلم اٹھاؤں اور یہ افسانہ لکھ کر کسی پرچے کو بھیج دوں۔

میں خوش تھا کہ چلو ایک افسانہ ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کیلئے دوسرے کمرے میں گیا میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں تو وہ معاملہ پڑا تھا یعنے میرا ریلوے کا پاس جس میں دس دس کے چھ نوٹ ملفوف تھے میں دوسرے کمرے میں کپڑے پہن رہا تھا۔

کپڑے پہن کر جب باہر نکلا۔ تو یوں سمجھے جیسے افسانوں کی دنیا سے باہر آیا۔

فوراً مجھے خیال آیا کہ میری سکیم کیا تھی ۔ ؟ لیکن کہ اپنی ہو گئی۔

میرا ریلوے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت غائب تھا۔

میں نے فوراً اپنے شریف نوکر کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: کہ بیگم افتخار کہاں ہے؟

اس نے جواب دیا۔ صاحب وہ کپڑے لینے گیا ہے۔"

میں نے صرف اتنا کہا۔ "تو اس نے اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔"

کریم خاں کی تلاش کی، مگر وہ نہ ملا۔ میں غسل خانے میں انسانی نفسیات کو صابن اور پانی سے دھوتا اور صاف کرتا رہا۔ مگر افتخی نے مجھے صاف کر گیا۔ اس لئے کہ اسی صبح جب میں بمبئی ٹاکیز کی برقی ٹرین میں روانہ ہوا۔ تو میرے پاس "پاس" نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر آیا تو میں پکڑا گیا۔ مجھے کافی جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

انجام نخجیر

بٹوارے کے بعد جب فرقہ وارانہ فساد بہت شدت اختیار کر گئے اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے زمین رنگی جانے لگی۔ تو نسیم اختر جو دہلی کی نو خیز طوائف تھی، اپنی بوڑھی ماں سے کہا۔ "چلو ماں یہاں سے چلیں۔"

بوڑھی نائکہ نے اپنے پوپلے منہ میں پاندان سے چھالیہ کے باریک باریک ٹکڑے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا "کہاں جائیں گے بیٹا؟"

"پاکستان" یہ کہہ کر وہ اپنے استاد خان صاحب اچھن خاں سے مخاطب ہوئی: "خاں صاحب آپ کا کیا خیال ہے؛ یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں۔"

خاں صاحب نے نسیم اختر کی ہاں میں ہاں ملائی: "تم کہتی ہو مگر بائی جی کو منا لو تو سب چلیں گے۔"

نسیم اختر نے اپنی ماں سے بہتیرا کہا کہ چلو اب یہاں ہندوؤں کا راج ہوگا۔ کوئی مسلمان باقی نہیں چھوڑیں گے۔"

بڑھیل نے کہا "تو کیا ہوا۔ ہمارا دھندا تو ہندوؤں ہی کی بدولت چلتا ہے۔ اور تمہارے چاہنے والے بھی سب کے سب ہندو ہی ہیں۔ مسلمانوں میں رکھا ہی کیا ہے؟

"ایسا نہ کہو۔ ان کا مذہب اور ہمارا مذہب ایک ہے۔ قائداعظم صاحب نے اتنی محنت سے مسلمان کے لئے پاکستان بنایا ہے ہمیں اب وہیں رہنا چاہیے۔"

مانڈو میراثی نے افیم کے نشہ میں اپنا سر ہلایا اور غنودگی بھری آواز میں کہا "چھوٹی بائی اللہ سلامت رکھے تمہیں۔ کیا بات کہی ہے — میں تو ابھی چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میری قبر وہاں بنے تو میری روح ہمیشہ خوش رہے گی۔"

دوسرے میراثی تھے، وہ بھی تیار ہو گئے۔ لیکن بڑی بائی ملک چھوڑنا نہیں چاہتی تھی بالا خانے پر اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس لئے سب خاموش ہو گئے۔

بڑی بائی نے سیٹھ گوبند پرکاش کی کوٹھی پر آدمی بھیجا اور اس کو بلا کر کہا "میری بچی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ پاکستان جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے سمجھایا وہاں کیا دھرا ہے؟ یہاں آپ ایسے مہربان سیٹھ لوگ موجود ہیں۔ وہاں جا کے ہم اُپلے تھاپیں گے۔ آپ ایک کرم کیجیے۔

سیٹھ بڑی بائی کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر اس نے بڑی بائی سے پوچھا "تو کیا چاہتی ہے؟"

ہمارے کوٹھے کے نیچے دو تین بندوقوں والے سپاہیوں کا پہرہ کھڑا کروا دیجیے۔ تاکہ میری بچی کا سہم دور ہو۔

سیٹھ گوبند پرشاد نے کہا: "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ میں ابھی جا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے جا کر ملتا ہوں۔ شام سے پہلے پہلے سپاہی موجود ہوں گے۔

نسیم کی ماں نے سیٹھ کو بہت دعائیں دیں۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے کہا: "ہم آج اپنی بائی نسیم اختر کا مجرا سننے آئیں گے۔

بڑھیا نے اٹھ کر تعظیماً کہا: "ہائے جم جم آیئے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بچی کو آپ اپنی کنیز سمجھئے۔ کھانا یہیں کھائیے گا۔"

"نہیں۔ میں آج کل پرہیزی کھانا کھا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا۔

شام کو نسیم کی ماں نے چاندنیاں بدلوائیں۔ گاؤ تکیوں پر نئے غلاف چڑھوائے۔ زیادہ روشنی کے بلب لگوائے۔ سیٹھ کے لئے اعلےٰ قسم کے سگرٹوں کا ڈبہ منگوا بھیجا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نوکر بدحواس ہانپتا کانپتا واپس آگیا۔ اس کے منہ سے ایک بات نہیں نکلتی تھی۔ آخر جب وہ کچھ دیر کے بعد سنبھلا۔ تو اس نے بتایا کہ چوک میں پانچ چھ سکھوں نے ایک مسلمان خوانچہ فروش کو کرپانوں سے اس کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ جب اس نے یہ دیکھا۔ تو سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا۔ اور یہاں آن کے دم لیا۔"

نسیم اختر یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے خان صاحب رحیمن خاں اسے ہوش میں لائے۔ مگر وہ بہت دیر تک نڈھال رہی اور خاموش خلا میں دیکھتی رہی۔ آخر اس کی ماں نے کہا: "خون خرابے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کیا اس سے پہلے قتل نہیں ہوتے تھے؟"

دم دلاسا دینے کے بعد نسیم آخر سنبھل گئی۔ تو اس کی ماں نے اس سے بڑے دلار اور پیار سے کہا:"اٹھو میری بچی۔ جاؤ پشواز پہنو۔ سیٹھ آتے ہی ہوں گے۔"

نسیم بادل نخواستہ پشواز پہنی۔ سولہ سنگھار کئے اور مسند پر بیٹھ گئی۔ اس کا جی بھاری بھاری تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس مقتول خوانچہ فروش کا سارا خون اس کے دل و دماغ میں جم گیا ہے۔ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زرق برق پشواز کی بجائے سادہ شلوار قمیص پہن لے اور اپنی ماں سے ہاتھ جوڑ کر بلکہ اس کے پاؤں پڑ کر کہے " خدا کے لئے میری بات سنو۔ اور چلو بھاگو یہاں سے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم پر کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔"

بڑھیا نے جھنجھلا کر کہا:"ہم پر کیوں آفت آنے لگی۔ ہم نے کس کا کیا بگاڑا ہے۔"

نسیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:" اس غریب خوانچہ فروش نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ جو ظالموں نے اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔ بگاڑنے والے الٹے بچ جاتے ہیں۔ لٹے جاتے ہیں جنہوں نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہوتا۔

تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

"ایسے حالات میں کس کا دماغ درست رہ سکتا ہے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں:" یہ کہہ کر وہ اٹھی بالکنی میں کھڑی ہو گئی اور نیچے بازار میں دیکھنے لگی۔ اسے بجلی کے کھمبے کے پاس چار آدمی کھڑے دکھائی دیئے۔ جن کے پاس ہنڈیتیں

تھیں۔ اس نے خان اچھن خاں کو بتایا اور یہ آدمی دکھائے: "ایسا لگتا تھا کہ وہی سپاہی ہیں جن کو بھیجنے کا وعدہ سیٹھ کر گیا تھا۔

خان صاحب اچھن خاں نے ان آدمیوں کو اپنی چندھی آنکھوں سے بغور دیکھا "نہیں یہ سپاہی نہیں۔ سپاہیوں کی تو وردی ہوتی ہے مجھے تو گنڈے معلوم ہوتے ہیں۔"

نسیم اختر کا کلیجہ دھک سے رہ گیا: "گنڈے!"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لو یہ تمہارے کوٹھے کی طرف آ رہے ہیں۔ دیکھو نسیم، تم کسی بہانے سے اوپر کوٹھے پر چلی جاؤ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ مجھے دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔"

نسیم اختر چپکے سے باہر نکلی اور اپنی ماں سے نظر بچا کر اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خان صاحب اچھن خاں اپنی چندھی آنکھیں جھپکاتا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

نسیم اختر جس کا دل جیسے ڈوب رہا تھا۔ خان صاحب سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

وہی جو میں نے سمجھا تھا۔ تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے۔ کہتے تھے سیٹھ گوبند پر کاش نے کار بھیجی ہے۔ اور بلایا ہے!!

تمہاری ماں بہت خوش ہوئی۔ بڑی مہربانی ہے ان کی۔ میں دیکھتی ہوں کہاں ہے۔ شاید غسل خانے میں ہو۔ اتنی دیر میں تیار ہو جاؤں۔"

ان گنڈوں میں سے ایک نے کہا "تمہیں کیا سیٹھ شہد لگا کے چاٹیں بیٹھی رہو۔ جہاں بیٹھی ہو۔ خبردار جو تم یہاں سے ہلیں۔ ہم خود تمہاری بیٹی کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔"

میں نے جب یہ باتیں سنیں اور ان گنڈوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو کھسکتا کھسکتا یہاں پہنچ گیا ہوں۔

نسیم اختر حواس باختہ تھی۔ "اب کیا کیا جائے؟"

خان نے اپنا سر کھجلایا اور جواب دیا۔ "دیکھو میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔ بس یہاں سے نکل بھاگنا چاہیئے۔

"اور ماں!"

"اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کو اللہ کے حوالے کر کے خود کو باہر نکلنا چاہیئے۔

ادھر چارپائی پر دو چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ خاں صاحب نے ان کو گانٹھ دے کر رسا سا بنایا اور مضبوطی سے ایک کنڈے کے ساتھ باندھ کر دوسری طرف لٹکایا۔ نیچے لانڈری کی چھت تھی۔ وہاں تک اگر وہ پہنچ جائے تو آگے رستہ صاف تھا۔ لانڈری کی چھت کی سیڑھیاں دوسری طرف تھیں۔ اس کے ذریعے سے وہ طویلے میں پہنچ جاتے اور وہاں سائیس سے جو مسلمان تھا تانگہ لیتے اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کرتے۔

نسیم اختر نے بڑی بہادری دکھائی۔ آرام آرام سے نیچے اتر کر لانڈری

کی چھت تک پہنچ گئی۔ خان صاحب اچھن خاں بھی بحفاظت تمام اتر کے اب وہ طویلے میں تھے۔ سائیس اتفاق سے تانگے میں گھوڑا جوت رہا تھا۔ دونوں اس میں بیٹھے اور اسٹیشن کا رخ کیا۔ مگر راستے میں ان کو ملٹری کا ٹرک مل گیا۔ اس میں مسلح فوجی مسلمان تھے۔ جو ہندوؤں کے خطرناک محلوں سے مسلمانوں کو نکال نکال کر محفوظ مقاموں پر پہنچا رہے تھے۔ جو پاکستان جانا چاہتے۔ ان کو سپیشل ٹرینوں میں جگہ دلوا دیتے۔

تانگہ سے اتر کر نسیم اختر اور اس کا استاد ٹرک میں بیٹھے اور چند منٹوں میں اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اسپیشل ٹرین اتفاق سے تیار تھی۔ اس میں ان کو اچھی جگہ مل گئی۔ اور وہ بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ یہاں وہ قریب قریب ایک مہینے تک والٹن کیمپ میں رہے۔ نہایت کس مپرسی کی حالت میں۔ اس کے بعد وہ شہر چلے آئے۔ نسیم اختر کے پاس کافی زیور تھا۔ جو اس نے اس رات پہنا ہوا تھا۔ جب سیٹھ گوبند پرکاش اس کا مجرا سننے آ رہا تھا۔ یہ اس نے اتار کر خان صاحب اچھن خاں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان زیوروں میں کچھ بیچ کر انہوں نے ہوٹل میں رہنا شروع کر دیا۔ لیکن مکان کی تلاش جاری رہی۔ آخر بدقت تمام ہیرا منڈی میں ایک مکان مل گیا۔ جو اچھا خاصا تھا۔

اب خان صاحب اچھن خاں نے نسیم اختر سے کہا۔ "گدے اور چاندنیاں وغیرہ خرید لیں اور تم بسم اللہ کر کے مجرا شروع کر دو۔"

نسیم نے کہا۔ "نہیں خان صاحب۔ میرا جی اکتا گیا۔ میں تو اس مکان میں بھی رہنا پسند نہیں کرتی۔ کسی شریف محلے میں کوئی چھوٹا سا مکان تلاش

کیجیے۔ تاکہ میں وہاں اٹھ جاؤں۔ میں اب خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

خاں صاحب کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی "کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟"

بس جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ میں اس زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ دعا کیجیے۔ خدا مجھے ثابت قدم رکھے۔" اور یہ کہتے ہوئے نسیم اختر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خاں صاحب نے اس کو بہت ترغیب دی۔ پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اس نے ایک دن اپنے استاد سے صاف کہہ دیا۔ کہ وہ شادی کر لینا چاہتی ہے اگر کسی نے اس کو قبول نہ کیا تو وہ کنواری رہے گی۔

خان صاحب بہت حیران تھا۔ کہ نسیم میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ فسادات تو اس کا باعث نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ پیشہ ترک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور شادی کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔ تو اُسے ایک محلے میں جہاں شرفا رہتے تھے۔ ایک چھوٹا سا مکان لے دیا۔ اور خود ہیرا منڈی کی ایک مالدار طوائف کو تعلیم دینے لگا۔

نسیم نے تھوڑے سے برتن خریدے۔ ایک چارپائی اور بستر وغیرہ بھی ایک ایک چھوٹا لڑکا نوکر رکھ لیا۔ اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگی۔ پانچوں نمازیں پڑھتی روزے آئے تو اس نے سارے کے سارے ہی رکھے۔

ایک دن وہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ کہ سب کچھ بھول کر اپنی سریلی آواز میں گانے لگی۔ اس کے ہاں ایک اور عورت کا آنا جانا تھا نسیم اختر کو معلوم

نہیں یہ عورت شریفوں کے محلے کی بہت بڑی پھاپھا کٹنی ہے۔ شریفوں کے محلے میں کئی گھر تباہ و برباد کر چکی ہے۔ کئی لڑکیوں کی عصمت اونے پونے داموں بکوا چکی ہے۔ کئی نوجوانوں کو غلط راستے پر لگا اپنا اُلو سیدھا کرتی رہی ہے۔

جب اس عورت نے جس کا نام جنتے تھا۔ نسیم کی سریلی اور منجھی ہوئی آواز سنی۔ تو اس کا معاً یہ خیال آیا کہ لڑکی جس کا آگا ہے نہ پیچھا۔ بڑی معرکے کی طوائف بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس پہ ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس کو اس نے کئی سبز باغ دکھلائے۔ مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئی آخر ایک روز اس نے اس کو گلے سے لگا لیا اور چٹ چٹ بلائیں لینا شروع کر دیں "جیتی رہو بٹیا میں تو تمہارا امتحان لے رہی تھی۔ تم اس میں سولہ آنے پوری اُتری ہو"

نسیم اختر اس کے قریب میں آگئی۔ ایک دن اس کو یہاں تک بتا دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ ایک یتیم کنواری لڑکی کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

جنتے کو موقع ہاتھ آیا۔ اس نے نسیم سے کہا: "بیٹیا یہ کیا مشکل ہے میں نے یہاں شادیاں کرائی ہیں۔ سب کی سب کامیاب رہی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری حسب منشا میاں مل جائے گا۔ جو تمہارے پاؤں پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔

جنتے کئی فرضی رشتے لائی۔ مگر اس نے ان کی کوئی زیادہ تعریف نہ کی۔ آخر میں وہ ایک رشتہ لائی۔ جو اس کے کہنے کے مطابق فرشتہ سیرت اور صاحب جائداد تھا۔ عمر کا بھی زیادہ نہیں تھا۔ نسیم اختر مان گئی۔ تاریخ

مقرر کی گئی ۔ اور اس کی شادی انجام پا گئی۔

نسیم اختر خوش تھی کہ اس کا میاں بہت اچھا ہے۔ اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن ایک دن اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ جب اس کو دوسرے کمرے سے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ درازیں سے جھانک کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر دو بوڑھی طوائفوں سے اس کے متعلق باتیں کر رہا ہے۔ جنتے بھی پاس بیٹھی تھی۔ سب مل کر اس کا سودا طے کر رہے تھے اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بہت دیر روتی اور سوچتی رہی۔ آخر اُٹھی اپنی پشواز نکال کر پہنی اور باہر نکل کر سیدھی اپنے اُستاد اچھن خاں کے پاس پہنچی۔ اور مجرے کے ساتھ پیشہ بھی شروع کر دیا۔ ایک عجیب قسم کے انتقامی جذبے کے ساتھ وہ کھیلنے لگی۔

ملاقاتی

آج صبح آپ سے کون ملنے آیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم — میں تو اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔"

"آپ تو بس ہر وقت سوئے ہی رہتے ہیں — آپ کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا۔ حالانکہ آپ سب کچھ جانتے ہوتے ہیں۔"

"یہ عجیب منطق ہے۔ اب مجھے کیا معلوم کون صبح سویرے تشریف لایا تھا۔ کوئی آیا ہو گا۔ میرے ملنے والا — یا کوئی اور شخص جسے سفارش کرانا ہو گی۔"

"آپ کی سفارش کہاں چلتی ہے — بڑے آئے ہیں گورنر کہیں کے۔"

"میں نے گورنری کا دعوےٰ کبھی نہیں کیا۔ لیکن ادھر اُدھر میری تھوڑی سی واقفیت ہے۔ اس لئے دوست یار کبھی کبھی کسی رشتہ دار کو یہاں لے آتے ہیں۔ کہ میں اس کی سفارش کر دوں۔"

"آپ بات ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میری اس بات کا جواب دیجئے کہ صبح سویرے آپ سے ملنے کے لئے کون آیا تھا؟"

"بھئی کہہ تو دیا تم سے کہ مجھے مطلق معلوم نہیں۔ میں اندر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ تمہیں اتنا تو یاد ہونا چاہیئے کہ رات بڑے بچے کو بخار تھا۔ اور میں دیر تک جاگتا رہا۔ اس کے بعد اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور نو بجے تک سویا رہا۔"

"میں تو اوپر کوٹھے پہ تھی ـــــ ہو سکتا ہے کہ آپ اُٹھ کر اس سے مل لئے ہوں۔"

"کس سے کچھ پتہ بھی تو چلے۔"

"آپ کو پتہ چل جائے گا۔ جب میں یہ گھر چھوڑ کر میکے چلی جاؤں گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں ایکا ایکی کیا ہو جاتا ہے ـــــ تمہارے دماغ میں یقیناً کچھ فتور ہے۔"

"فتور ہو گا آپ کے دماغ میں ـــــ میرا دماغ اچھا بھلا ہے۔ دیکھئے میں آپ سے کہہ دوں کہ آپ زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے۔ مجھ سے آپ کی یہ بدزبانیاں اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔"

"تم خود پہلے درجے کی بدزبان ہو۔ کیا عورت کو اپنے شوہر سے اس طرح بات کرنی چاہیئے۔"

"جو شوہر اس قابل ہو گا۔ اس سے اس قسم کے لہجے میں گفتگو کرنا پڑے گی۔"

"بند کرو اس گفتگو کو ـــــ میں تمہاری اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم تو میکے جاتی رہو گی۔ میں اس سے پہلے اس گھر سے

نکل چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"کسی جنگل میں۔"

"وہاں جا کر کیا کیجیئے گا؟"

"سنیاسی بن جاؤں گا۔" تم سے چھٹکارا تو مل جائے گا۔ خدا کی قسم چند برسوں سے تم نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بات بات پہ نوک جھونک کرتی ہے۔ آخر یہ سلسلہ کیا ہے ۔ جانے کون کم بخت صبح مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ خود کہتی ہو کہ تم کوٹھے پہ تھیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا، کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ کبھی تُک کی بات بھی کیا کرو۔"

"آپ تو ہمیشہ تُک کی بات کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ آپ دفتر سے آئے۔ تو میں نے آپ کی سفید قمیص پہ لال رنگ کا ایک دھبہ دیکھا میں نے پوچھا۔ یہ کیسے لگا۔ آپ سٹ پٹا گئے۔ مگر فوراً سنبھل کر ایک کہانی گھڑ دی کہ لال پنسل سے کھجلا رہا تھا۔ شاید یہ اس کا نشان ہو گا۔ حالانکہ جب آپ نے قمیص اتاری اور اس دھبے کو میں نے غور سے دیکھا۔ تو وہ لپ اسٹک کا دھبہ تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"جناب اس لال دھبے سے خوشبو بھی آ رہی تھی۔ کیا آپ کے دفتر کی لال پنسلوں میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔"

"عورت کا دوسرا نام اپنے خاوند کی ہر بات کو شک کی نظروں سے دیکھنا

ہے۔ کل صبح تم ہی نے تو میری اس قمیص میں سینٹ لگایا تھا۔

"لگایا ہوگا۔ مگر وہ داغ یقیناً لپ اسٹک کا تھا۔"

"یعنی لپ اسٹک لگے ہونٹ میری قمیص چومتے رہے ہے۔"

"آپ کو باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔ قمیص چومنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے۔ کیا ہونٹ ویسے ہی قمیص سے نہیں چھو سکتے۔"

"چھو سکتے ہیں بابا۔ چھو سکتے ہیں۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کوئی یوسف ہوں، اکہ لڑکیاں میرے حسن سے اس قدر متاثر ہوتی ہیں۔ کہ غش کھا کر مجھ پہ گرتی جاتی ہیں۔ اور میں جھاڑو ہاتھ میں لے کر سڑکوں سے یہ کوڑا کرکٹ اُٹھاتا رہتا ہوں۔

"مرد ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں۔"

"دیکھو، تم عورت ذات کی خود عورت ہو کر توہین کر رہی ہو —— کیا عورتیں اتنی ہی کمزور کردار کی ہیں۔ کہ ہر مرد کے آگے پائدان کی طرح بچھ جائیں۔ خدا کے لئے کچھ تو اپنی صنف کا خیال کرو۔ میں نے تو ہمیشہ ہر عورت کی عزت کی ہے۔"

"عزت کرنا ہی تو آپ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جو بے چاری بھولی بھالی عورت کو آپ کے جال میں پھنسا دیتا ہے۔"

"میں کوئی چڑی مار نہیں۔ جو جال بچھاتا پھرے۔"

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ چڑی ماروں کے گرو ہیں۔"

"یہ رتبہ آج تم نے نیا بخشا ہے۔ آٹھ دس روز ہوئے مجھے کمینہ کہا گیا تھا۔ آج چڑی ماروں کا گرو۔ پرسوں یہ ارشاد ہوگا کہ تم ہٹلر ہو۔"

"وہ تو آپ ہیں ۔۔۔ اس گھر میں چلتی کس کی ہے؟ جو آپ کہیں وہی ہوگا۔ جو کہے رہے گا۔ میں تو تین میں ہوں نہ تیرہ میں۔"

"میں کہتا ہوں، اب یہ فضول بکواس بند ہو جانی چاہیئے۔ میرا دماغ چکرا گیا ہے۔"

"دماغ آپ کا بہت نازک ہے۔ ذرا سی بات کرو تو چکرانے لگتا ہے میں عورت ہوں۔ میرا دماغ تو آج تک آپ کی باتوں سے نہیں چکرایا۔"

"عورتیں بڑی سخت دماغ ہوتی ہیں۔ یوں تو انہیں صنفِ نازک کہا جاتا ہے۔ مگر جب واسطہ پڑے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان ایسی صنفِ کرخت دنیا کے تختے پر اور کوئی بھی نہیں۔"

"آپ حد سے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔"

"کیا کروں ۔۔۔ تم جو میرا دماغ چاٹ گئی ہو۔ تم اتنا تو سوچو کہ میں دفتر میں آٹھ گھنٹے جھک مار کے گھر آیا ہوں۔ تھکا ماندہ ہوں۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اور تم لے بیٹھی ہو۔ ایک فرضی قصہ اکہ تم سے ملنے کے لئے صبح سویرے کوئی آیا تھا ۔۔۔ کون آیا تھا؟ ۔ یہ بتا دو تو سارا جھنجھٹ ختم ہو۔"

"آپ تو بس بات ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"کون خر ذات بات ٹالنا چاہتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کسی

نہ کسی حیلے ختم ہو۔" لو اب بتا دو، کون آیا تھا، مجھ سے ملنے؟"

"ایک چڑیل تھی۔"

"وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی ـــــ میرا اس سے کیا کام؟"

"یہ آپ اسی سے پوچھئے گا۔"

"اب تو مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ ـــ بتاؤ کون آیا تھا؟ ـــ لیکن تم تو اوپر کوٹھے پر سو رہی تھیں۔"

"میں کہیں بھی سوؤں، لیکن مجھے ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔"

"اچھا بھئی، میں تو اب ہار گیا۔ نہا دھو کر کلب جاتا ہوں، کہ طبیعت کا تکدر کسی قدر دُور ہو۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ اس سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"خدا کی قسم! آج میرا دماغ پاش پاش ہو جائے گا ـــ میں کس سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"اُسی سے!"

"تمہارا مطلب ہے۔ اس چڑیل سے۔"

"اب آپ سمجھ گئے ـــــ تو کلب جا کر آپ کو اور کس سے ملنا ہے ـــــ مجھ سے۔"

"تم تو ہر وقت میرے سینے پر سوار رہتی ہو۔"

"اسی لئے تو آپ اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنے جا رہے ہیں ـــ کسی دن مجھے زہر ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ تاکہ قصّہ ہی ختم ہو۔"

"اتنی دیر تو میں پاگل نہیں ہوا — لیکن آج ضرور ہو جاؤں گا!"

"اس لئے کہ میں نے آپ کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہے!"

"میری تو ہر رگ آج دُکھ رہی ہے — تم نے مجھے اس قدر جھنجھوڑا اور لتاڑا ہے کہ اللہ کی پناہ — تم عورت نہیں ہو — لندھور پہلوان ہو!"

"یہ سُننا آپ سے باقی رہ گیا تھا — نہ رہے وہ چڑیل اس دنیا کے تختے پر۔"

"پھر وہی چڑیل دیکھو باہر ڈیوڑھی سے مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی ہے!"

"آپ ہی جا کر دیکھئے!"

"لاحول ولا — عورتوں کو دیکھنا میرا کام نہیں۔ تمہارا ہے!"

"نوکر سے کہتی ہوں!"

⁂ ⁂ ⁂

"بی بی جی، وہی بی بی آئی ہیں، جو آج صبح آئی تھیں!"

"میں چلتا ہوں۔"

"نہیں نہیں — وہ آپ ہی سے تو ملنے آئی ہے!"

⁂ ⁂ ⁂

"اوہ! ذکیہ — تم — تم — تم یہاں کب آئیں؟"

"ہوائی جہاز میں پہلے نیروبی سے کراچی پہنچی۔ پھر وہاں سے یہاں ہوائی جہاز میں ہی آئی۔ ابا جی باہر کھڑے ہیں!"

• تم نے بھی حد کر دی ذکیہ - میں خود جاتی ہوں، اپنے ابا جی کو لینے اتنی مدت ہو گئی ہے ان کو دیکھے ہوئے۔

سیگرٹ اور فاؤنٹین پن

"میرا پارکر ففٹی ون کا قلم کہاں گیا؟"

"جانے میری بلا!"

"میں نے صبح دیکھا کہ تم اس سے کسی کو خط لکھ رہی تھیں۔ اب انکار کر رہی ہو؟"

"میں نے خط لکھا تھا، مگر اب مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں غارت ہو گیا؟"

"یہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی چیز غارت ہوتی ہی رہتی ہے۔ مینٹل پیس پر آج سے دس روز ہوئے میں نے اپنی گھڑی رکھی، صرف اس لئے کہ میری کلائی پر چند پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ دوسرے دن دیکھا وہ غائب تھی!"

"کیا میں نے چرائی تھی؟"

"میں نے یہ کب کہا۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ گئی کہاں — تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے یہ گھڑی وہیں رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دس روپے آٹھ آنے تھے، یہ تو وہیں ہے، لیکن گھڑی جس کی قیمت دو سو چھتر روپے تھی، وہ غائب ہو گئی۔ تم پر میں نے چوری

کا الزام کب لگایا ہے؟"

"ایک گھڑی آپ کی پہلے بھی گم ہوگئی تھی۔"

"ہاں!"

"میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ آپ نے خود انہیں بیچ کھایا ہے۔"

"بیگم! تم ایسی بے ہودہ باتیں نہ کیا کرو۔ مجھے وہ دونوں گھڑیاں بہت عزیز تھیں۔ اس کے علاوہ ان کو بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ میری آمدن اللہ کے فضل سے کافی ہے۔ بینک میں اس وقت میرے دس ہزار سے کچھ اوپر روپے جمع ہیں۔ گھڑیاں بیچنے کی ضرورت مجھے کیسے پیش آسکتی تھی؟"

"کسی دوست کو دیدی ہوگی۔"

"کیوں۔ کیا مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی؟ ۔۔۔ میں تو گھڑی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔۔۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسا چھکڑا ہوں جس میں کوئی پہیہ نہیں۔ وقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ گھر میں کلاک ہے مگر وہ تمہاری طرح نازک مزاج ہے۔ ذرا موسم بدلے تو جناب بند ہو جاتے ہیں۔ پھر جب موسم ان کے مزاج کے موافق ہو۔ تو چلنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"یعنی میں کلاک ہوں۔"

"میں نے صرف تشبیہہ کے طور پر کہا تھا۔ کلاک تو بہت کام کی چیز ہے۔"

"اور میں کسی کام کی چیز نہیں؟ ۔۔۔ شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے۔"

"میں نے تو صرف مذاق کے طور پر یہ کہدیا تھا۔ تم خواہ مخواہ ناراض ہوگئی ہو۔"

"میں آج تک کبھی آپ سے خواہ مخواہ ناراض ہوئی ہوں۔ آپ خود ایسے

موقعے دیتے ہیں کہ مجھے ناراض ہونا پڑتا ہے۔"

"تو چلیئے ـــ اب صلح ہو جائے۔"

"صلح وُلح کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی ـــ ان پندرہ برسوں میں آپ سے میں پندرہ ہزار مرتبہ آپ سے صلح صفائی کر چکی ہوں، مگر نتیجہ کیا نکلا ہے ـــ وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"ڈھاک کے تین پاتوں کو چھوڑو ـــ تم مجھے میرا پارکر قلم لا کے دو۔ مجھے چند بڑے ضروری خط لکھنے ہیں۔"

"مجھے کیا پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ـــ لے گیا ہوگا کوئی اُٹھا کر ـــ اب میں ہر چیز کا دھیان تو نہیں رکھ سکتی۔"

"تو پھر تم کس مرض کی دوا ہو؟"

"میں نہیں جانتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کہ آپ میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہیں۔"

"تو یہ روگ دور کر دو ـــ ہر روگ کا کوئی نہ کوئی علاج موجود ہوتا ہے۔"

"خدا ہی دور کرے گا یہ روگ ـــ یہ کسی حکیم یا ڈاکٹر سے دور ہونے والا نہیں۔"

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے کہ میں مر جاؤں۔ تو میں اس کے لئے تیار ہوں ـ میرے پاس اتفاق سے اس وقت ایک قاتل زہر موجود ہے۔ میں تمہارے سامنے کھا کر مر جاتا ہوں!"

"مر جائیے!"

"اس کے لئے تو میں تیار ہوں۔ تاکہ روز روز کی بک بک اور جھک جھک ختم ہو جائے"

"آپ تو چاہتے ہیں کہ اپنے فرائض سے چھٹکارا ملے ـــ بیوی بچے جائیں بھاڑ

میں۔ آپ آرام سے قبر میں سوتے رہیں ـــــ لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ وہاں کا عذاب یہاں کے عذاب سے ہزار گنا زیادہ ہوگا۔

"ہوا کرے ـــ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس پر قائم ہوں۔"

"آپ کبھی اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔ تو اس پر قائم رہتا ہوں ابھی پچھلے دنوں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں سگرٹ نہیں پیوں گا۔ چنانچہ اب تک اس پر قائم ہوں۔"

"پاخانے میں سگرٹ کے ٹکڑے کہاں سے آتے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ تم پیتی ہوگی۔"

"میں ـــ مجھے تو اس چیز سے سخت نفرت ہے۔"

"ہوگی ـــ مگر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر پاخانہ بھی کوئی ایسی معقول جگہ ہے جہاں سگرٹ پیا جائے۔"

"چوری چھپے جو پینا ہوا۔ پاخانے کے علاوہ اور موزوں و مناسب جگہ کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میرے ساتھ فراڈ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کی رگ رگ پہچانتی ہوں۔"

"یہ تم نے مجھ سے آج ہی کہا کہ میں پاخانے میں چھپ چھپ کر سگرٹ پیتا ہوں"

"میں نے اس لئے اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا تھا۔ کہ آپ چونکہ تمباکو کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے سگرٹ نوشی آپ ترک نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بہر حال بہتر ہے کہ آپ دو ایک سگرٹ دن میں پی لیتے ہیں۔ جہاں آپ پچاس کے قریب پھونکا کرتے تھے۔

"میں نے ڈھائی برس میں ایک سگرٹ بھی نہیں پیا ـــ بھنگی پیتا ہوگا۔

"بھنگی گولڈ فلیک اور کریون اے نہیں پی سکتا۔"

"حیرت ہے۔"

"کس بات کی؛ حیرت تو مجھے ہے کہ آپ صاف انکار کر رہے ہیں۔ مجھے بتائیے میں

"نہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سیگریٹ وہاں کون پیتا ہے؟

"آپ کے سوا اور کون پی سکتا ہے۔ مجھے تو اس کے دھوئیں سے کھانسی کی شکایت ہو جاتی ہے —— مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے معلوم نہیں آپ لوگ کس طرح اس واہیات چیز کا دھواں اپنے اندر کھینچتے ہیں۔

"خیر اس کو چھوڑ دو —— میرا پارکر کا قلم مجھے دو۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس نہیں ہے، تو کیا میرے پاس ہے؟ —— آج صبح تم خدا معلوم کسے خط لکھ رہی تھیں۔ تمہاری انگلیوں میں میرا ہی قلم تھا؟"

"تھا —— لیکن مجھے کیا معلوم کہاں گیا۔ میں نے آپ کے میز پر رکھ دیا ہوگا۔ اور آپ نے اٹھا کر کسی دوست کو دے دیا ہوگا۔ آپ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔"

"دیکھو بیگم! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ قلم میں نے کسی دوست کو نہیں دیا۔ —— ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنی کسی سہیلی کو دے دیا ہو۔"

"میں کیوں اتنی قیمتی چیز کسی سہیلی کو دینے لگی۔ وہ تو آپ ہیں کہ ہزاروں اپنے دوستوں میں لٹاتے رہتے ہیں۔"

"اب سوال ہے کہ وہ قلم ہے کہاں؟ —— مجھے چند ضروری خطوط لکھنا ہیں —— جاؤ میری جان —— ذرا تھوڑی سی تکلیف کرو۔ ممکن ہے ڈھونڈھنے سے مل جائے۔"

"نہیں ملے گا۔ آپ فضول مجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا کروں دوات، اور پن ہولڈر لے آؤ۔"

"دوات تو صبح آپ کی بچی نے توڑ دی۔ پن ہولڈر آپ کے بھانجے بیٹے نے"

"اتنے پن ہولڈر تھے۔ کہاں گئے؟"

"مجھے کیا معلوم؟ — آپ ہی استعمال کرتے ہیں؟"

"میں نے تو آج تک پن ہولڈر کبھی استعمال نہیں کیا۔ کبھی کبھی تم کیا کرتی ہو جبکہ میرا فاؤنٹین پن دستیاب نہ ہو۔"

"آپ کی بچیاں آفت کی پتلیاں ہیں، وہی توڑ پھوڑ کے باہر پھینک دیتی ہوں گی۔"

"تم دھیان کیوں نہیں رکھتیں۔"

"کس کس چیز کا دھیان رکھوں۔ مجھے گھر کے کام کاج ہی سے فرصت نہیں ہے"

"اسی لئے تو میری دو گھڑیاں غائب ہوئیں۔ کہ تمہیں گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے تو جب دیکھا، تم پلنگ پر لیٹی ہو۔ خدا معلوم تم گھر کا کام کاج وہیں لیٹی لیٹی کرتی ہو۔

"گھر کا سارا کام تو آپ کرتے ہیں۔

"میں اس کا دعوٰی نہیں کرتا، بہر حال جو کچھ میں کر سکتا ہوں کرتا رہتا ہوں۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"ہفتے میں ایک دو دفعہ مارکیٹ جاتا ہوں۔ مرغ اور مچھلی خرید کر لاتا ہوں انڈے بھی — کوئلے کی پرمٹ حاصل کرتا ہوں — گھی کا بندوبست کرتا ہوں۔ اب میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ بصروفت آدمی ہوں، دفتر میں جانا ہوتا ہے۔ وہاں نہ جاؤں تو

تو مہینہ ختم ہونے کے بعد سات سو روپے کیسے آسکتے ہیں۔"

"ان سات سو روپوں میں سے آپ مجھے کتنے دیتے ہیں؟"

"پورے سات سو!"

"ٹھیک ہے۔ لیکن آپ اپنا گذارہ کس طرح کرتے ہیں؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔"

"رشوت لیتے ہیں — اور کیا؟ — ورنہ ساری تنخواہ مجھے دینے کے بعد آپ پانچ سو پچپن کے سگرٹ نہیں پی سکتے۔"

"میں نے سگرٹ پینے ترک کر دیئے ہیں۔

"آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔"

"میں اس بحث میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ تم میرا پارکر قلم ذرا ڈھونڈھ کے نکالو۔"

"میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو اور کس کے پاس ہے۔"

"مجھے کیا معلوم — میں صبح خط لکھا اور سنگل ٹیبل پہ رکھ دیا۔"

"وہاں تو اس کا نام و نشان نہیں۔"

"آپ نے کسی دوست کو بخش دیا ہوگا۔ گیارہ بجے آپ کے چند دوست آئے تھے۔"

"میرے دوست کہاں تھے۔ صرف ملاقات کرنے آئے تھے ان تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔"

"میرا نام بھی آپ بھول گئے ہوں گے — بتائیے کیا ہے؟"

"تمہارا نام —؟ لیکن بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے — تم تم ہو — بس"!

"ان پندرہ برسوں میں آپ کو میرا نام بھی یاد نہیں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کس قسم کے انسان ہیں؟"

"قسمیں پوچھو گی تو حیران ہو جاؤ گی — ایک کروڑ سے زیادہ ہوں گی۔ اب جاؤ۔ میرا قلم ڈھونڈو۔"

"میں نہیں جانتی کہاں ہے؟"

"یہ قمیص تم نے نئی سلوائی ہے؟"

"ہاں!"

"گریبان بہت خوبصورت ہے — ارے — یہ اس میں تو میرا قلم اٹکا ہوا ہے!"

"سچ! — میں نے یہاں اڑس لیا ہو گا — معاف کیجیے گا۔"

"ٹھہرو، میں خود نکال لیتا ہوں — ممکن ہے تم قمیص پھاڑ ڈالو!"

"یہ کیا گرا ہے؟"

"یہ کیا ہے — ارے یہ تو پانچ سو پچپن سگرٹوں کا ڈبہ ہے۔ کہاں سے آ گیا؟"

”تین[۳] میں نہ تیرہ[۱۳] میں“

"میں تین میں رہوں نہ تیرہ میں نہ سُتلی کی گرہ میں۔"

"اب تم نے اردو کے محاورے بھی سیکھ لئے۔"

"آپ میرا مذاق کیوں اڑاتے ہیں ـــ اردو میری مادری زبان ہے!"

"پدری کیا تھی! تمہارے والد بزرگوار تو ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے بڑے مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اتنی دیر لکھنؤ میں رہے۔ وہاں پچیس برس اُردو بولتے رہے، لیکن مجھ سے ہمیشہ انہوں نے پنجابی ہی میں گفتگو کی۔ کہا کرتے تھے اُردو بولتے بولتے میرے جبڑے تھک گئے ہیں۔ اب ان میں کوئی سکت باقی نہیں رہی۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"میں تو ہمیشہ جھوٹ بولتا ہوں۔ کوئی بات بھی تم سے کہوں، تم یہی سمجھو گی کہ جھوٹ ہے۔ حالانکہ جھوٹ بولنا عورت کی فطرت ہے۔"

"آپ عورت ذات پر ایسے رکیک حملے نہ کیا کریں۔ مجھے بڑی ہی کوفت ہوتی ہے۔"

"بہت بہتر آئندہ محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔"

"صرف کوشش کریں گے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ اپنی زبان ایسے معاملوں

میں قطعی طور پر بند رکھیں گے۔"

"یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا۔ بندہ بشر ہے، ہو سکتا ہے۔ بھولا میرے منہ سے کچھ نکل جائے، جسے تم حملہ قرار دے دو۔"

"میں یہ سوچتی ہوں کہ آپ۔ آپ کس قسم کے شوہر ہیں۔ بس ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں ـــ پرسوں میں نے آپ سے کہا کہ منجھلی کو ٹائی فائیڈ ہو گیا ہے تو آپ نے مسکرا کر کہا۔ فکر نہ کرو، ٹھیک ہو جائے گی۔ لڑکا ہوتا تو فکر و تردّد کی بات تھی۔ لڑکیاں نہیں مرا کرتیں۔"

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ سب سے چھوٹی اوپر کی منزل سے نیچے گری اور بچ گئی۔ دو مرتبہ اسے ہیضہ ہوا۔ چیچک نکلی۔ نمونیا ہوا۔ مگر وہ زندہ ہے اور اپنی دو بڑی بہنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تندرست ہے۔"

"آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"یہ کوئی منطق نہیں میری جان ـــ قدرت کو یہی منظور ہے کہ مرد دنیا میں کم ہو جائیں اور عورتیں زیادہ ـــ تمہارا پہلا بچہ جو لڑکا تھا اُسے معمولی سا زکام ہوا اور وہ دوسرے دن اللہ کو پیارا ہو گیا ـــ تمہاری بڑی لڑکی کو تین بار ٹائی فائیڈ ہوا، لیکن وہ زندہ ہے۔ میرا خیال ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب اس دنیا میں کوئی مرد نہیں رہے گا۔ صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں گی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ مردوں کے بغیر تم عورتوں کا گزارہ کیسے ہو گا؟"

"یعنی جیسے آپ لوگوں کے بغیر ہمارا گذرہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم بہت خوش رہیں گی ـــ مردوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ سمجھئے، کہ ہمارے تمام دکھ درد کا

خاتمہ ہو گیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"تم آج محاوروں کو بہت استعمال کر رہی ہو۔"

"آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض ہو بھی کیا سکتا ہے۔ محاورے میری املاک نہیں ـــ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ تم آج محاورے زیادہ استعمال کر رہی ہو۔"

"دو ہی تو کئے ہیں۔ یہ زیادہ ہیں کیا؟"

"زیادہ تو نہیں لیکن اندیشہ ہے کہ تم دس بیدرہ اور مجھ پر ضرور لڑھکاؤ گی۔"

"تھوتھا چنا باجے گھنا۔ آپ اتنا گرج کیوں رہے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔"

"دو محاورے اور آ گئے۔ خدا کے لئے ان کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آج ناراضی کی وجہ کیا ہے؟"

"ناراضی کا باعث آپ کا وجود ہے۔ مجھے آپ کی ہر حرکت بُری معلوم ہوتی ہے۔"

"میں اگر تم سے پیار محبت کی باتیں کرتا ہوں تو وہ بھی تمہیں بُری لگتی ہیں۔"

"تو اور کیا چاہئے۔"

"یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے ـــ میں کیا جانوں ـــ شوہر کو اپنی بیوی کو سمجھنا چاہئے ـــ وہ کیا چاہتی ہے، کیا نہیں چاہتی اس کو اس کا علم پوری طرح ہونا چاہئے ـــ آپ تو بالکل غافل ہیں۔"

"میں کوئی قیافہ گیر، رمز شناس اور نفسیات کا ماہر نہیں کہ تمہیں پوری طرح

— میں اس معاملے میں گدھا ہوں۔"

"آپ اونٹ ہیں اُونٹ!"

"کس لحاظ سے!"

"اس لیے کہ آپ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔"

"اچھا بھلا ہوں۔ میری ہر کل سیدھی ہے۔ ابھی تم نے مجھ سے پرسوں کہا تھا کہ آپ چالیس برس ہونے کے باوجود ماشاءاللہ جوان دکھائی دیتے ہیں۔ تم نے میرے بدن کی بھی بہت تعریف کی تھی۔"

"وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔ ورنہ آپ تو اب جھڑوس ہو چکے ہیں۔"

"دیکھو ایسی بدزبانی مجھے پسند نہیں۔ تم بعض اوقات ایسی بکواس شروع کر دیتی ہو۔ جو کوئی شریف عورت نہیں کر سکتی۔"

تو گویا میں شریف نہیں — فاحشہ ہوں — بازاری عورت ہوں میں نے آپ کو کیا گالی دی جس پہ آپ کو اتنا طیش آگیا۔ کہ آپ نے مجھ کو بدزبان کہہ دیا۔

"بھئی میں اب جھڑوس ہو چکا ہوں۔ مجھ سے بات نہ کرو۔"

"میں آپ سے بات نہ کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔"

"میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں — تم اپنے بھنگی سے گفتگو کر سکتی ہو۔ اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ میں جھڑوس ہو گیا ہوں۔"

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ نے یہ کیسی بات کہی ہے۔"

"بھنگی اور مجھ میں کیا فرق ہے؟ جس طرح تم اس غریب سے پیش آتی ہو اسی طرح کا سلوک مجھ سے کرتی ہو۔"

"نکمّے بیچارے غریب بنے پھرتے ہیں۔ اور اب مجھ سے کہتے ہیں کہ میں بھنگی کے ساتھ بات کیا کروں۔ غیرت کا مادہ تو آپ میں رہا ہی نہیں"۔

"میں نر ہوں۔ مادہ تم ہو"۔

"اس سے کیا ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ مرد عورتوں کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں ہم میں کیا برائی ہے کیا عیب ہے۔ یہی نا کہ ہمارے والدین نے غلطی سے آپ کے ساتھ میری شادی کر دی"۔

"شادی تو آخر کسی جگہ ہونی ہی تھی۔ تم کیا کرتیں اگر نہ ہوتی؟"

"میں بہت خوش رہتی۔ شادی میں آخر پڑا ہی کیا ہے؟"

"کیا پڑا ہے۔ خاک! — میں تو کنواری رہتی تو اچھا تھا۔ اس بک بک میں تو نہ پڑتی"۔

"کس بک بک میں؟"

"یہی جو آئے دن ہوتی رہتی ہے"۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ روز روز کی ترخ ترخ صرف تمہاری وجہ سے ہوتی ہے ورنہ میں نے ان پندرہ برسوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ کہ تمہاری خدمت کروں"۔

"خدمت؟"

"خدمت نہ کہو! میں اپنا فرض ادا کرتا رہا ہوں خاوند کو یہی کرنا چاہیے تمہیں مجھ سے کس بات کا گلہ ہے!"

"ہزاروں گلے ہیں ایک ہو تو بتاؤں؟"

"ان ہزاروں گلوں میں سے ایک گلہ تو مجھے بتا دو۔ تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں"۔

"آپ کی اصلاح اب ہو چکی۔ آپ تو ازل سے بگڑے ہوئے ہیں"۔

"یہ اطلاع تمہیں کہاں سے ملی تھی؟ میں تو اس سے بالکل بے خبر ہوں"۔

"آپ کی بے خبری کا تو یہ عالم ہے کہ آپ کو خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔"

"غالب کا ایک شعر ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
خود اپنی خبر نہیں آتی۔"

"غالب جائے جہنم میں۔ اس وقت تو آپ مجھ پر غالب ہیں۔"

"لاحول ولا! میں تو جھڑ دس ہو چکا ہوں۔ ازل سے بگڑا ہوا ہوں۔"

"آپ میری ہر بات کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے اتنی طاقت ہے نہ مجال — لیکن میں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آج آپ کی ناراضی کا باعث کیا ہے؟"

"کیا؟"

"آپ خود سوچئے۔ بڑے سمجھدار ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں؟"

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ تمہارے کانوں کے لئے "ٹوپس" لے کر آؤں گا۔ مگر میں جس دکان میں گیا۔ وہاں مجھے دل پسند ٹوپس نہ ملے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ لٹھے کا ایک تھان لے کر آؤ۔ میں نے شہر بھر میں ہر جگہ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تمہارے ریشمی کپڑے جو لانڈری میں دھلنے کے لئے گئے تھے۔ میں ان کو وصول کرنے گیا۔ مگر لانڈری والے نے کہا کہ اس کے دھوبی بیمار ہیں۔ اس لئے دو دن انتظار کیجئے۔ تمہاری گھڑی جو خراب ہو گئی تھی۔ اس کے متعلق بھی میں نے پوچھا۔ گھڑی ساز نے کہا کہ اس کا ایک پرزہ بنانا پڑے گا۔ جو وہ بنا رہا ہے۔"

"آپ بہانے بنانا خوب جانتے ہیں۔"

"خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں — تمہاری قمیصیں کل درزی سے آجائیں گی۔ اس

کو میں نے بہت ڈانٹا کہ تم نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ اُس نے کہا، حضور کل لے جائیے گا۔"
"قمیصیں جا لگیں بھاڑ میں۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ کو تو کچھ ہوش ہی نہیں۔"

"میں کیا بے ہوش رہتا ہوں — تمہیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت اس لئے تھی کہ آپ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اگر میں نے ایک جملے میں اپنا مُدّعا بیان کیا ہوتا۔"

"تو از راہ کرم اب تم ایک جملے میں اپنا مدعا بیان کر دو۔ تاکہ میری خلاصی ہو۔"

"میری داڑھ اتنی تکلیف دے رہی ہے، کئی مرتبہ آپ سے کہہ چکی ہوں، کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلئے مجھے، مگر —"

"ابھی چلو! — داڑھ کیا، تم چاہو تو سب دانت نکلوا دوں گا۔"

ایشیا کی عظیم ناول نگار مصنفہ

اے۔ این خاتون

کے چند معاشرتی گھریلو ناول

ماہ درخشاں ۱۱-۰۰

نور افشاں ۷-۵۰

شمع درخشاں ۷-۵۰

نیند ہماری خواب تمہارے (جذباتی جنسی ناول)

ظفر احمد قریشی قیمت ۵ روپے

ظفر برادرز ظفر منزل

بنک سکوئر دی مال لاہور

دی مال مری